Registered No. L. 4186

شعبان، رمضان، شوال ۱۳۵۷ھ　　　　جلد ۱۳ — عدد ۲، ۳، ۴

۸۶ھ

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے　　　　قیمت ف پرچہ ایکروپیہ آٹھ آنے

ترجمان القرآن

کے

سابق پرچے

ترجمان القرآن کے سابق پرچوں کی بہت مانگ ہے
ان دنوں اکثر حضرات نے یہ پرچے طلب فرمائے
ہیں - اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں

★

محرم ۱۳۵۲ھ سے لیکر اب تک کے تمام پرچے ماسوا
چند ایک اعداد کے اکثر موجود ہیں اور ۸ آنے
فی پرچہ کے حساب سے مل سکتے ہیں
ضرورت مند حضرات جلد طلب فرمائیں
کیونکہ پھر اکثر جلدیں ناقص رہ جائینگی

مینیجر

فہرست مضامین

ماہ شعبان، رمضان، شوال ۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۳۸ء

جلد ۱۳ - عدد - ۲، ۳، ۴

	صفحہ
۱- مقدمہ	۸۵
۲- مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اسکے نتائج	۹۵
۳- غلط فہمیاں اور خام خیالیاں	۱۱۲
۴- قوم پرستوں کے نظریات	۱۲۴
۵- آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی	۱۴۴
۶- حصول آزادی کا طریقہ	۱۶۶
۷- جنگ آزادی کا مطمح نظر	۱۷۶
۸- قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ	۱۸۹
۹- بنیادی حقوق	۲۰۹
۱۰- جنگ آزادی کی نوعیت	۲۲۸
۱۱- تنبیہ الغافلین	۲۹۰
۱۲- ہمارا نصب العین اور طریق کار	۳۰۲

چوہدری نیاز علی خاں پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ترجمان القرآن واقع دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع ہوا۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

(حصہ دوم)

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ سیاسی حالات کا تفصیلی تجزیہ

اسلامی جماعتوں کی سیاسی روش پر تنقید۔
جدید انقلابی نصب العین کی توضیح۔

از

ابوالاعلیٰ مودودی

صفحه خالی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

(حصہ دوم)

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ سیاسی حالات کا تفصیلی تجزیہ

اسلامی جماعتوں کی سیاسی روش پر تنقید۔
جدید انقلابی نصب العین کی توضیح۔

از

ابوالاعلیٰ مودودی

خـــالی صفحـــه

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کا ایک مجموعہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا مجموعہ اسی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

کسی قوم کیلیے اُس وقت سے زیادہ پریشانی و سراسیمگی کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا جب وہ دیکھتی ہے کہ اسکے گردوپیش سارا ماحول اسکے خلاف بدل گیا ہے، زندگی کے کارخانہ کو چلانیوالی تمام طاقتیں اُن اصول اور اُن مناہج کے خلاف چل رہی ہیں جن پر اعتقاداً و عملاً اُس کے وجود قومی کی اساس قائم ہے، اور وہ اُس درخت کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کیلیے زمین، ہوا، پانی، موسم، سب کے سب ناموافق و ناسازگار ہو گئے ہوں۔ بدقسمتی سے آج ہم ہندوستان کے مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت ہم پر اسی حالت میں گذر گئی ہے، اور روز بروز یہ حالت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کو یہ پریشانی پیش نہیں آئی اسلیے دوسرے لوگ اُس الجھن کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ انکے لیے ہر بدلی ہوئی صورت کے مطابق بدل جانا اور اپنی ہیئت کو ہر سانچے میں ڈھال لینا سہل ہے۔ ان

کے اعتقادات اور اصول حیات انکے وجود سے الگ ایک چیز ہیں جن کے بدل جانے اور سراسر الٹ جانے کے بعد بھی ان کا وجود جوں کا توں رہتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتقادات اور اصولِ حیات عین ہمارا وجود ہیں، اور انکے بدل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا ہے، ہم ایک الجھن میں مبتلا ہیں، اور یہ الجھن بڑھتی جارہی ہے، کیونکہ ہمارے گردوپیش ایک ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے اور بنتا جا رہا ہے جس میں ہم کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

انگریزی حکومت جب ہندوستان پر مسلط ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ماحول میں ایک ہمہ گیر تغیر رونما ہونا شروع ہوگیا۔ ہم صرف مقام عزت واقتدار ہی سے گرا نہیں دیے گئے بلکہ ایک غیر مسلم قوم کے غلبہ و استیلا ر کا یہ نتیجہ روز بروز زیادہ شدت کیسا تھ ہمارے سامنے آنے لگا کہ ہمارے گردوپیش افکار، نظریات، اصول اخلاق، طرز تمدن، معیار تہذیب، قوانین معاشرت ومعیشت، نظام حکومت و سیاست، غرض ایک دنیا کی دنیا بدلتی چلی جارہی ہے اور اسکی ہر چیز ہمارے اجتماعی مزاج اور ہماری قومی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

اول اول ہم نے کوشش کی کہ پتھر کی ایک چٹان بن کر تغیر و انقلاب کی اس رو کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کے ہم اہل بھی نہ تھے۔ صدیوں کے جمود نے ہم میں اتنی صلاحیت ہی باقی نہ رہنے دی تھی کہ ہم اس انقلاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے اور نہ اتنی طاقت باقی چھوڑی تھی کہ سوچ سمجھ کر اُن تدابیر کو عمل میں لاتے جو کسی انقلاب کے مقابلہ میں اختیار کرنی چاہییں۔ اتنی صلاحیت اور طاقت ہم میں ہوتی تو یہ انقلاب رونما ہی کیوں ہوتا۔

ایک صدی تک خوب پسنے اور مادّی و اخلاقی حیثیت سے تباہ ہوجانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ تغیرات زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بنکر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد ہمارے

دانشمندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تلقین کی اور وہ یہ تھی کہ:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ہم نے کہا کہ آؤ اسی کو آزما دیکھیں، شاید اپنے آپ کو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانے کی رو کے ساتھ بہنے کیلیے تیار کیا۔ پھر غیر مسلم حکومت کی بارگاہ میں درخور حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنی کھوئی ہوئی مادّی طاقتوں میں سے کم از کم ایک معتد بہ حصہ بازیافت کریں۔ پھر اپنے ملک کے جدید سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی کہ زمانہ کا یہ سیلاب جس طرف جارہا ہے اسی طرف سب کے ساتھ ہم بھی جائیں۔

یہ تغیرات جو ہم نے اپنی پوزیشن میں کیے، ان سب میں ہمارے پیش نظر یہ مسلک رہا کہ اپنی خودی کا تحفظ بھی کرو اور زمانے کے ساتھ بھی چلو۔ لیکن ستّر برس کے تجربے پر ایک غائر نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس زمانہ سازی کے دور میں ہم اپنی خودی کو محفوظ رکھ سکے ہیں؟ واقعات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور عقل اس کو محال کہتی ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ جو کھونٹے سانچے میں آپ ٹھیک بھی بیٹھیں اور اپنی ہیئت کی گولائی کو تبدیل بھی نہ کریں۔ دریا کے رخ پر بہیں بھی اور اپنی جگہ پر قائم بھی رہیں۔ یہ دو باتیں بالکل متضاد ہیں اور ان کو جمع کرنا صریح عقل کے خلاف ہے۔

مغربی تعلیم کے تجربے سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے محض ایک عنصر یعنی "تعلیم" کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جن کے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے، خود بخود اسکے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطۂ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک مختلف معیار،

متمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز کو قبول کرتے ہی خواندہ و ناخواندہ آنے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نا مسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔

سرکار فرنگ کے دربار میں پہنچ کر ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ کہ دین، ایمان، اخلاق، تہذیب، تمدن سب کچھ ایک روٹی کے عوض دیدو اور روٹی بھی پیٹ بھر نہ ملے۔ اپنی خودی کو قربان کیے بغیر وہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتے، اور اس قربانی کے بعد بھی تمہاری حیثیت ایک خادم سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو ایک متاعِ حقیر کی طرح آقا کے مفاد پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں زمانہ سازی کا پھل کیا ملا؟ یہ کہ تمام سیاسی تغیرات جو اب تک ہوئے، اور جو آئندہ ہونے والے ہیں، ہمارے نظریات عمرانی کے بالکل خلاف اور خداوندان فرنگ کے نظریات عمرانی کے عین مطابق ہیں۔ ان کا نظریۂ قومیت، انکے اصول جمہوریت، ان کے تصورات حکومت و سلطنت، انہی چیزوں پر تمام جدید تغیرات کی بنا رکھی گئی ہے، اور ایسے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے معنی اپنے وجود کو ایک دوسرے وجود میں بالکل تحلیل کر دینے کے ہیں۔

ان تجربات کے بعد اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظر ثانی کریں۔ پہلی پالیسی قریب قریب سو برس کے تجربہ سے غلط ثابت ہوئی اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلدی بدل ڈالنا چاہیے۔ اب ہمارے لیے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں

اپنی خودی کو قربان کیے بغیر ٹھیک بھی نہیں بیٹھ سکتے، لہذا آؤ اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو اور اسے مجبور کرو کہ تمہاری ہئیت کے مطابق بنے۔ جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح تحلیل ہوا جاتا ہے، اور اسکے مقابلہ میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہذا آؤ، اب بہادروں کی طرح اٹھ کر اس سیلاب کا رخ پھیر دو اور اسے اُس رخ پر بہنے کیلیے مجبور کرو جو تمہاری فطرتِ مُسلمہ کے مقتضار سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم خود ہی اس لڑائی میں ہلاک ہو جاؤ۔ مگر بکری کی زندگی کے سو برس سے شیر کی زندگی کا ایک دن بہرحال زیادہ قیمتی ہے۔

یہی انقلابی ذہنیت ہے جسے میں اب مسلمانوں میں، خصوصاً ان کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ انقلابی ذہنیت یکایک پیدا نہیں ہوتی۔ زمانہ کی سخت ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ دماغ درستی پر آتا ہے، اور اِن ٹھوکروں کے ساتھ آہستہ آہستہ انقلابی ذہنیت اُس کے اندر اترتی ہے۔ اس دوران میں آدمی کو بڑے سخت مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ باہر والوں سے پہلے گھر والوں سے لڑائی، اور لڑائی بھی چومکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ قدیم پالیسی جن دماغوں میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہے وہ انقلاب کی دعوت سن کر اول تو اس کا مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر کچھ کچھ سمجھتے بھی ہیں تو اسے اپنے عادی تصورات کے خلاف پاکر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی نیا دوکاندار آیا ہے جو ہماری پرانی جمی ہوئی دوکانوں کے مقابلے میں اپنی دوکان جمانے کیلیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی گہری سازش ہے جسے دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کوئی تیوری بدل کر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے بال قومی خدمت میں سفید کیے ہیں ان کے مقابلہ میں نوخیز، طفلِ مکتب ہو کر تمہیں زبان

کھولتے شرم نہیں آتی - کوئی آوازہ کستا ہے کہ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ - اور کوئی نہنگِ سال خوردہ سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے ایک سرپرستانہ نگاہ اس رَو کے خلاف تیرنے والی مچھلی پر ڈالتا ہے اور بس یہ کہکر آگے بہ نکلتا ہے کہ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں -

پھر پرانے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جسے انقلاب کے داعی کو توڑنا پھوڑنا ہوتا ہے، اور نئے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو اُسے بنانی پڑتی ہے - لوگ پرانے خیالات سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ تنقید کر کے ان کی بنیادیں ہلا نہ دی جائیں - اور نئے خیالات قبول نہیں کر سکتے جب تک کہ تعمیری افکار کو حکمت عملی کے ساتھ پیش کر کے انہیں قابل قبول نہ بنا دیا جائے، اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں مطمئن نہ کر دیا جائے کہ اس مضبوط ڈھانچے کو جس کی گرفت میں تم طوعاً یا کرہاً آ گئے ہو، یوں توڑا جا سکتا ہے اور اسکی جگہ یہ ڈھانچہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں تم ٹھیک بیٹھ سکتے ہو، اور یہ دوسرا ڈھانچہ اس طرح بننا ممکن ہے - اس کام میں تخریبی تنقید اور جدید تعمیر دونوں ساتھ ساتھ کرنی پڑتی ہیں - جب تک یہ دونوں کام تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور پریشان خیالیوں کا ایک گہرا غبار ہر طرف چھایا رہتا ہے جسکی وجہ سے پرانے خیالات کے معتقدین اور جدید و قدیم کے درمیان بھٹکنے والے مذبذبین کے ایک انبوہ کثیر کو انقلابی نصب العین کا نقطہ صاف نظر نہیں آ سکتا کہ وہ اُس پر جمع ہو سکیں، اور جب تک یہ نقطہ واضح ہو کر اس قابل نہیں بن جاتا کہ قوم کی عملی قوتیں اس پر مجتمع ہوں، اس وقت تک عملی جدوجہد کی راہ میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا - پس یوں سمجھیے کہ ابتداءً سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ قدیم خیالات کا طلسم پیہم ضربوں سے توڑا جائے اور جدید خیالات کیلیے راہ صاف کی جائے -

ہونا ہے اور ہو کر رہیگا، لہذا عافیت اسی میں ہے کہ اسکے آگے سپر رکھ دو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصلی کارفرما اور کارکن گروہ ہے، غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خود غرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرز..... جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرز جمہوریت، اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہا بنا دیتا ہے، اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے، لہذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیماکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہیے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ۵۳ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لیے ایک ایسا دستور حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہل ملک کے سامنے جواب دہ ہو۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائینگے۔ بظاہر پہلے موقف سے یہ دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے، مگر اصولی حیثیت سے "ڈیماکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہ آج بھی وہی ہے، خواہ دستور حکومت سرکار بنائے یا یہ خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی و نظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۵۵ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان کے یہ آقا دے رہے ہیں وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوئے ہیں، اور نظم و نسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو آئیڈیل سمجھتا ہے اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے کہ مختلف حالات کیلیے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے ابتک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان، انگلستان نہیں ہے، اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں، مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ انکے ذہن میں ہر پھر کر جمہوریت

کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آجاتے ہیں جنکے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اہل ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہل انگلستان ایک قوم ہیں۔ وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیے جائیں جو واحد قومیت ہی کیلیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لیے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ــــ جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں ــــ اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے۔ مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات انکے دماغ میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اسوقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قرار دیکر اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لیکر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجالس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیے ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا، اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ اور زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر اس کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبۂ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں لہذا ان کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہو جانا چاہیے، کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اسکے عین حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لیے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے، حتیٰ کہ اگر کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب چائے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے

وہاں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بتایا ہے اسکے درست ہونے میں شک کیا جائیگا - یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، مگر وماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے - جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں انکی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک ایک وزیر ہند (لارڈ آیبو یرن) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت و قومیت کے منافی نہ قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافی قومیت و جمہوریت ہے - اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لیکر پنڈت جواہر لال تک ہر ایک اس زعم کیساتھ اس کا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکار دوالاتبار کی سند حاصل ہے اسکے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہو سکتی ہے! پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ سرکار کے قائم کیے ہوئے جمہوری ادارات کو وہ جمہوریت کی ایک ہی فطری و برحق صورت سمجھتے ہیں، اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا انکے نزدیک سیاسی اصلاح و ترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح و ترقی کی صراط مستقیم ایک ہی ہے جسکی طرف غلاموں کے ھادی برحق ——— صاحب بہادر ——— نے انکی رہنمائی کی ہے اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کر دیا جائے۔ صاحب کے دیے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین واذعان اور انشراح و اطمینان اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے راز کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے اسلیے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا ہے۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل بھی ہے جو انھوں نے صاحب کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کو دنیوی (Secular) یعنی غیر دینی ہونا چاہیے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو، اسکی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت نہ کرے، مگر اسکے ساتھ ہی وہ مخالفِ دین (Anti-religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم (Recognise) کرے، اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کر دے جو اندرونی تنظیم کیلیے ضروری ہیں، مثلاً اپنے پیرووں پر ٹیکس عائد کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور انکی دینی تعلیم کا انتظام کرنا عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام میں نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی لیگوسلیویا، پولینڈ، لتھوانیا، فنلینڈ، اور ایستھونیا میں یہی مفہوم ہے۔ غیر دینی اسٹیٹ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی پر (Negation) قائم ہو، مخالفِ دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے، باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگانِ ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لہذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کیلیے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ لادینی کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک ظالمانہ (Aggressive) جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔ اسکی مثال چیکوسلواکیا ہے جہاں تعلیم کا نظام کلیۃً حکومت کے ہاتھ میں ہے اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے اور حکومت

سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامی دین (Defender of the Faith) بھی ہیں، اسٹیٹ کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ (Ecclesiastical Department) بھی قائم ہے، اسکے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے (یعنی لادینی کا پہلا مفہوم)، مگر عملاً باشندگان ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو چیکوسلواکیا کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب مکسچر کی تحلیل اگر سائنٹفک طریقہ سے کی جائے تو اسکے تین اجزاء برآمد ہونگے:-

۱- مذہبی رواداری کا اعلان واظہار۔

۲- ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظر عنایت۔

۳- دوسرے تمام عقائد و مسالک کیساتھ سنگدلانہ سرد مہری

ہندوستان میں "دنیوی اسٹیٹ" کا یہ مرکب تصور فکر و عمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دنیوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جسکی بنا کسی مذہب پر نہ ہوگی مگر اس میں مذہبی رواداری ہوگی۔ یہ آقایان نامدار کے بنائے ہوئے مکسچر کا پہلا جزء ہے۔ اور دوسرا جزء یہ ہے کہ ان کا لیڈر[1] ایک "مہاتما" ہے جو صداقت (Truth) اور اہنسا (Non-violence) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے، جسکے تصورات جنگ آزادی کی فکری بنیاد ہیں، جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد

[1] پنڈت جواہر لال کے بقول "کانگریس سے عظیم تر" (Bigger than Congress itself)

پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے۔ اسکی رہنمائی میں تمام باشندگان ہند کیلیے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے۔ اب رہ گیا تیسرا جزء، تو اسکی بھی پوری مقدار اس معجون میں شریک کی گئی ہے۔ صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندگان کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو جبراً ایسی تعلیم دے جو انکے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے۔ تو وہ مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے مذہب کو باصرار وردھا اسکیم کا جزو لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظام تعلیم سے خارج کر دینے کیلیے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں :-

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جسکے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں۔ جب تک ہم اس خوشگوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائینگے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشو و نما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے۔ اگر قوم (۹ ہندوستانی قوم) پر یہی اختصاصی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئیگا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق

تعو وردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم، اور اصلاح دیہات کی اسکیم (جسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے) تینوں میں اہمسا کی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں، اور جہاں تک وردھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے[1]۔"

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنانند (یوپی کے وزیر تعلیم) نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے جو انہوں نے ۱۴ر اپریل ۳۸ء کو یوپی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی:۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کیلیے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں ہے تو اسکو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کیلیے ضرر رساں ہیں۔ بلکہ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اسیلیے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے[2]۔"

اسی تقریر کا ایک فقرہ یہ بھی ہے:۔

---

[1] "ہریجن" مورخہ ۱۶ر جولائی ۳۸ء

[2] "مدینہ" مورخہ ۲۱ر اپریل ۳۸ء

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکیگی"[۱]

ان تقریروں اور تحریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے۔ اور ایک معنیٰ میں لادینی بلکہ مخالف دین (Anti-religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا دین لیا جائے جو دین گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ اُن کے حق میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ رواداری نہ ہوگا بلکہ چیکوسلوواکیا کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اسکا مطمح نظر صریحاً یہ بتایا جارہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں، ان کا مذہبی زاویۂ نظر بدل جائے اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کیلیے اس کو سب سے بہتر اور صحیح ترجاننا فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کریگا اور اسکو تعلیم اور اندرونی تنظیم کیلیے وہ حقوق اور اختیارات دیگا جنکی مثالیں ہم نے اوپر یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستان کیلیے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں:

(۱) "نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کردی جائے۔

(۲) "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہند کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

(۳) "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذاہب کا تعلق

[۱] ٹریبیون مورخہ ۵ راپریل ۱۹۳۸ء

ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو[۱]

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں یا صبر و سکون کیساتھ اسکے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کرینگے۔

---

[۱] ۲۹ اگست ۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں اسٹیٹ کی انہی تین بنیادوں کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۳۸ء کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔

قومی ، جمہوری ، لادینی اسٹیٹ

کیا مسلمان اس کو قبول کر سکتے ہیں ؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کیلیے چند اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے ۔

لفظ اسٹیٹ ، جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے ، علم السیاست کی اصطلاح میں اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو ۔ قوت قاہرہ کا وجود ایک طرف ، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف ، ان دو چیزوں کے باہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے ۔

اسٹیٹ کی اس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوت قاہرہ جسکی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اُس آبادی کے اندر اسکے مجموعہ میں سے ابھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے ؟ ۔ اگر اسکے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے ۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے ایک نظمی ہیئت کو قوتِ قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اسکے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے ۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر آپ حکمراں ہونا ، یا بالفاظ دیگر حاکمیت سے

تخریبی تنقید کے مرحلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قدیم پالیسی کی غلطیاں اور مضرتیں ثابت کرنے کیلیے اُس پالیسی پر چلنے اور چلانے والوں کو تنقید کا ہدف بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور یہ ایسا کام ہے جسے دل پر پتھر رکھ کر انجام دینا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو بہت سی دوستیوں، بہت سی محبتوں، بہت سے پرانے تعلقات کی قربانی دینی پڑتی ہے، اور بہت سے ان بزرگوں کی ناراضی مول لینی ہوتی ہے جن کا وہ تمام عمر احترام کرتا رہا ہے اور جنکی بزرگی کے احترام سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں آدمی کو اس امر کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنقید کی شدت سے وہ جواب میں ضد پیدا نہ کر دے، اور کہیں جوابی حملے خود اس کے ذہنی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ غرض اس خارزار سے اس کو بہت ہی سنبھل کر گذرنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے اعصاب کی بندش چست رکھنی ہوتی ہے۔

انقلابی ذہنیت پیدا کرنے کیلیے تدریج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوتِ تحمل سے زیادہ خوراک دینا بھی مہلک ہے اور جتنی خوراک کی طلب ان میں پیدا ہو چکی ہو اس سے کم دینا بھی برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر آدمی کی قوت فیصلہ کا سخت امتحان ہوتا ہے، اور صرف خدا ہی کی مدد اسکو حالات کا صحیح اندازہ کرنے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھانے کی طاقت بخش سکتی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں، اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علمِ صحیح اور عقلِ سلیم کیلیے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اُس کام پر آمادہ کیا ہے جسکے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف، اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہرحال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر، جنکی طرف

متمتع ہونا جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو "جمہوری اسٹیٹ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اسٹیٹ جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اسکی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو انکے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے انکی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ انکی خواہشات کو وضع قوانین اور تنفیذ قوانین میں روبعمل لائے۔

جمہوری نظام کا عمل اسکے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اسکے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہذا عملی اغراض کیلیے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آکر وہ رخصت ہوجاتے ہیں، اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کرکے ان پر اپنی خواہشات مسلط کردے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراکِ عمل ہی سے تمدن کی مشین چلتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوشحالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کیلیے اسکی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کیلیے اسکی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جائے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض اور خواہشات حاصل کرے، اور جو گروہ قلیل تعداد میں ہے وہ غلام بنالیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر سے اسکی اغراض و خواہشات اسی طرح قربان کی جائیں جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جاسکتی ہیں۔ یہی

چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بد نما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اُس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی امور (Fundamentals) میں متفق ہوں، اور اُن کے درمیان اختلاف محض آراء کا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہوگی، نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی۔ لیکن اغراض —— یا خود غرضی —— کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرز زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت میں رہیگا اور جو اقلیت میں ہے وہ مستقل طور پر اقلیت میں رہیگا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں، اور محض اس بنا پر کہ انکے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہموطن لوگوں کی ایک معتدبہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کلی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانے پر چنگیزیت کہنا چاہیے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات اور اصول زندگی کا اساسی

اختلاف ہے، یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کردینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار، تجارت پیشہ اور دوکاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شائد زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سر نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو، وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمراں بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

چیکوسلواکیا میں اب سے ۲۰ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہوا آج اسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے ــــ سب سے بڑھ کر جن دو قوموں سے توقع تھی کہ ایک قوم بن جائینگی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czechs) دوسرے سلاوک (Slovaks)۔ نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گذشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی، اور وہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دو قوموں

کو ایک قوم بنا دینے کیلیے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکو سلاوک" وضع کر دی اور اس کو بالفعل موجود فرض کر کے ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنا دی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم نہیں بن جایا کرتی مصنوعی قومیت محک امتحان کی پہلی ہی رگڑ پر کھوٹی ثابت ہوئی۔ چیک کثیر التعداد تھے، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ سخت پابندِ مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں بھی چیکوں کی بہ نسبت ⅓ تھے۔ اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستور حکومت میں یہ طے کرا لیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک "دنیوی اسٹیٹ" (Secular State) ہوگا، اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائیگی مگر کسی مذہب یا مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائیگا۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہوگا، اور "ایسی تعلیم دی جائیگی جو سائنٹفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو"[1] دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کر دیئے اور نظام تعلیم سے مذہبی تعلیم کو قطعی خارج کر دیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کیلیے بطور خود کوئی انتظام کرنا چاہا تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً بڑے ذمہ داری کے مناصب کو چیکوں کے لیے مخصوص کر لیا گیا اور خود سلاوک علاقوں میں چیک افسر حکمراں بنکر آنے لگے۔ انہی باتوں نے آخر کار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا دراصل

[1] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کا چیکو سلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹ - ۱۲۱ - ۱۲۲ - ۱۲۴

چھوٹی قوم کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے۔ چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقہ کیلیے حکومت خود اختیاری (Autonomous Self-government) کا مطالبہ کر رہے ہیں[1]۔

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۳۰ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیے گئے تھے، (یعنی کل آبادی کا ¼ حصہ) جنکی قومیت، نسل، زبان، تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ مدارس میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے انکا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جسکی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے تاکہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[2]۔ اسقدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا جسمیں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھی، حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں یہی جرمن حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اسکا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام بنالے اور جمہوری نظام میں اسکو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔

[1] R. W. Seton-Watson, The New Slovakia

[2] C. D. Hazen, Europe Since 1815

سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص ان علاقوں میں بھی جہاں ۸۰ اور ۹۰ فیصدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کیلیے چیکوں کو ٹھیکے دیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سُڈیٹن جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرتی شروع ہو گئی اور انکے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اُس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جسکی "متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جزء یہ جرمن بھی تھے، جسکے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رو سے پورے شہری حقوق عطا کیے گئے تھے، اور جسکی دولت مشترکہ (Commonwealth) کی ملکیت میں وہ بھی ازروئے دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں، اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخر کار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقلمندی سے کام لیکر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا کو لیجیے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے ظالمانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلیے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرز زندگی میں اختلاف۔ مگر طلب آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظر انداز کر کے یہ سب گھل مل گئے، اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا"

رکھ لیا، اور اپنی الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo-Croatian Slovene) رکھا جس کا مسمیٰ کہیں دنیا میں موجود نہ تھا بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح ان کا ایک متحد نام رکھ دیا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسر پیکار ہوئیں تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیر اعظم اور جوگوسلا کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ :

> "سرب، کروٹ اور سلافینی ایک قوم ہیں۔ آئندہ کیلیے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ الگ ہوگا اور تینوں شرکاء کے جھنڈے الگ الگ ہونگے جنکی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح (Cyrillic) اور لیٹن دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہونگے، اور تینوں مذاہب یعنی آرتھوڈوکس، کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائیگا"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ ....کے قریب سرب تھے، تیس لاکھ کیتھولک کروٹس اور ۱۰ لاکھ سلافینی انکے علاوہ جرمن، مگیار، رومانی بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اسکی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اسکی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر لی، تمام اقلیتوں کو محکوم بنا لیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط

کی جانے لگی۔ تاسیس ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب کانسٹی ٹیوشن بنانے کیلیے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھ دی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایہ تخت سربیا کا پایہ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹائے، اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۸ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جسکو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا، کسی طرح نکل بچ نکلیں[1]۔

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجیے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملا کر ایک قومیت بنی ہے، جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجود کو مٹا کر رکھ دیا۔

سوئس قوم اور اسکی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً یہ ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اسکی مخالفت کی۔ ۱۵ آزاد خیال ریاستوں نے ان پر زبردستی

[1] تفصیلات کیلیے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں :-

C. D. Hazen, Europe since 1815

A. H. Morley, The New Democratic Consti- tution of Europe

Encyclopædia Britannica, Article : Yugoslavia

اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں از روئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کرکے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کردیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو بنیادی دستور بنایا گیا اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کرکے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کر دیے گئے تاکہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کرسکے اور اقلیت مجبور ہو کر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے۔[1]

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اول تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ، تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمائندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی۔ کوئی کیتھولک، کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو اینگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو، از روئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہوسکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہوسکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کیلیے عشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کیلیے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کیلیے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں اینگلیکن چرچ کے پیرووں کے سوا کوئی پورا نہ کرسکتا تھا، اسلیے ان دونوں

[1] Cambridge Modern History, vol. XI.

یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کیلیے بند تھے۔ چرچ آف انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حق دار تو تھے مگر وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اُٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۶۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخران کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادّی واخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا، اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کیا کرتے ہیں۔ شائد ان کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہونگے۔

یہاں مثالوں کا استقصار مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہد حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجودہ دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں اسکے لیے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دیکر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں، اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کسقدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہوسکتے ہیں۔

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگان ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو۔ مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کیساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی

اوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

پچھلا مجموعہ مرتب کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ابھی محض لوگوں کو چونکانے اور ان کے دماغوں کو انقلابی تصورات کیلیے تیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں میں نے مسلمانوں کی پچھلی تاریخ، انکے موجودہ حالات، اور انکے گرد و پیش کام کرنے والی قوتوں کے رجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا تھا کہ تمہارے اندر کیا کمزوریاں ہیں، اور باہر سے کس قسم کے خطرات تم کو گھیرے ہوئے ہیں، اور تمہاری تہذیب کی فطرت سے تمہارے ماحول کی طاقتیں کس طرح متصادم ہو رہی ہیں۔ اس تبصرے کے ساتھ میں نے جدید انقلابی نصب العین کی طرف محض چند اشارات کیے تھے اور انہیں قصداً زیادہ واضح نہیں کیا تھا تاکہ اچانک ایک نرالی آواز سن کر طبائع آمادۂ بغاوت نہ ہو جائیں۔

اب اس دوسرے مجموعہ میں، میں ایک قدم اور بڑھا رہا ہوں۔ اب میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور اسکی بنیادوں کا تجزیہ کیا ہے اور ایک ایک مقام پر انگلی رکھ کر بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں کیلیے ہلاکت ہے، اور یہاں ان کیلیے نقصان ہے، اور یہ چیزیں انکے مزاج قومی کے منافی ہیں — یہ ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کو محض خیالی خطرات سے ڈرایا جا رہا ہے — اسکے بعد میں نے مسلمانوں کے اُن رہنماؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے جو اب تک "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کے مسلک پر چلے جا رہے ہیں۔ جس قدر دلائل و شواہد میں فراہم کر سکتا تھا ان سب سے کام لے کر میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پورا نظام حکومت و سیاست جو ہم پر مسلط ہے، اپنے اصول و فروع سمیت، اُن اصولوں سے متصادم ہو رہا ہے جن پر

کر دی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے ہوگا کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اس کا ایسے اسٹیٹ کی رکنیت میں شامل ہونا خود بخود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کر دے۔ اس کی جداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار رہے، مگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کر سکے گا، بلکہ اسے ان فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجالس قانون ساز میں طے کر دے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لے کر بھی نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں اسکو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم، اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اسکے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اس وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کریگی۔ وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکیگا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے اور میں اکثریت کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اسکو جواب دیا جائیگا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں۔ مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کے عذرات پیش کرنیکا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپکی حیثیت محض ہندوستانی ہونیکی ہے، اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کر چکے ہیں، لہذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپکو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنیکے لیے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگیگا تو اس سے کہدیا جائیگا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اسکی حاکمیت میں جب آپکا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے

ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کیلیے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو جایئے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجیے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کس طرح بنتی ہے۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آراء پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کر کے ایک غلام اور محکوم قوم بنالے لیکن اگر صورت حال برعکس ہو۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں میں تقسیم کر دیا ہو، اور ان گروہوں میں ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہوگی اور اقلیت دائمی اقلیت ہوگی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور اسکو تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جائے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہوگا، اور لادینی اسٹیٹ صرف اقلیت کیلیے لادینی ہوگا۔ اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ

قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی، مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان وادب یا فلسفۂ حیات کا نام نہ لے سکیگی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اسکے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہے؟

(۱) ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے، تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں، اور آداب و اطوار اور طرز زندگی میں بھی اساسی اختلافات موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت خفیف۔ مگر یہاں آٹھ نو سو برس تک ایک آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود دونوں قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی وارنش تازہ تازہ چڑھا ہے، اسلیے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جسطرح کوئی امریکن سیاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ انکے دل میں اتر کر اور انکی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان

کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے؟ - دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے اسقدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الٰہی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مسلمان اسکو شوق سے کھاتا ہے، اور یہ فرق مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے، بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں۔ شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمان کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا - وہ ریل میں بھی اُس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا رہا ہو، بادلِ ناخواستہ ہی بیٹھتا ہے اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے - ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کیلیے بالکل بند ہیں - پیدائش سے لیکر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی اور غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ - ان میں اختلافات کے ہوتے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے

(۲) منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا تو ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا آج قومی اختلاف کا اثر انکے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہدے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے - مگر روزمرہ کے کاروبار میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھیے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے - کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے انکے لیے ہندو تیار کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑہت کے کاروبار میں مسلمان کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑہتیہ منڈی میں آتا ہے

تو پوری ہندو برادری اس کا دیوالہ نکلوانے کیلیے متحد ہو جاتی ہے؟ پھر کیا ابھی حال ہی میں سارے ہندوستان نے یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کے جدید زرعی قوانین پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشی مفاد بجائے ایک دوسرے کی ضد نکلے؟ سود خواروں کے غاصبانہ تسلط سے زمینداروں کا نکلنا مسلمانوں کے نزدیک رحمت تھا تو ہندوؤں کے نزدیک لعنت، اور اس تقسیم میں ہندو اور مسلمان اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑے ہوئے کہ بہت سے کانگریسی خیال کے مسلمان مسلمانوں کے ساتھ تھے اور قریب قریب تمام کانگریسی ہندو ——— بھولا بھائی ڈیسائی تک ——— ہندوؤں کے ساتھ۔ کیا یہ اس امر کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ معاشی معاملات میں بھی دونوں قوموں کی اغراض بڑی حد تک متصادم ہیں؟

(۳) پھر کیا سیاسی معاملات میں یہ لوگ قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کا طریقہ برتنے سے بچے ہوئے ہیں؟ بے شمار مثالوں کو چھوڑ کر میں صرف کانگریس کے حدود عمل سے چند کھلی ہوئی مثالیں پیش کرتا ہوں، اس لیے کہ یہی جماعت ہندوستانی قومیت کی مدعی ہے، اور اسلیے بھی کہ اسکے دائرے میں جو قومی امتیاز پایا جاتا ہے اسکا الزام برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شائد پنڈت جواہر لال بھی نہیں کر سکتے۔

۱- بہار اسمبلی میں ۲۹ راپریل ۳۸ء کو خود کانگریسی حکومت نے سوال نمبر ۲۶۹ کا جواب دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ صوبہ بہار کی ۴۴ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے ۲۹۹ نشستوں میں سے ۱۴۷ نشستیں مسلمانوں کو ملیں اور ۱۵۲ ہندوؤں کو، درانحالیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کم از کم ۹۳ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں، کیونکہ ان میونسپلٹیوں کے حدود میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۳ فی صدی ہے۔ یہ تو انتخابی نشستوں کا حال تھا۔ خود اس کانگریسی حکومت نے نامزدگی سے جو نشستیں پُر کیں ان کے متعلق خود اسکا اپنا اعتراف ہے کہ ۷۵ میں سے ۶۱ غیر مسلموں کو اور صرف ۱۴ مسلمانوں کو دی گئیں، حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ۲۵ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں

(ملاحظہ ہو سوال نمبر ۲۰۷ کا جواب - مورخہ ۲۹ اپریل ۳۸ء)

۲- سی پی کے ضلع بلڈانہ میں تعلقہ بورڈ کے ۲۷ حلقے ہیں اور ان میں سے کسی ایک حلقہ میں بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہوسکا۔ (ملاحظہ ہو قاضی سید محمود علی صاحب ملکاپوری کا خط مہاتما گاندھی کے نام - جو ۵ ستمبر ۳۸ء کے اخبار مدینہ میں شائع ہوا ہے)۔

۳- سی پی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان کا جو انتخاب ہوا اس میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہوسکا اور نہ کسی اچھوت پر کانگریسی ہندوؤں کی نظر انتخاب پڑ سکی (ملاحظہ ہو سی پی کے کانگریسی مسلمانوں کا شکایت نامہ - مدینہ ۲۰ جولائی ۳۸ء)

۴- اسی صوبۂ متوسط میں ایک درجن سے زیادہ میونسپل کمیٹیاں ایسی ہیں جن میں ایک مسلمان بھی مخلوط انتخاب کی وجہ سے منتخب نہیں ہوا۔ یہی حال اکثر لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ہے کہ وہ منتخب شدہ مسلمان نمائندوں سے بالکل خالی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مسٹر تاج الدین کا مراسلہ - اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲ جولائی ۳۸ء - نیز یہ خیال رہے کہ صاحب مراسلہ صوبہ متوسط کے مشہور نیشنلسٹ مسلمان ہیں)

۵- خود کانگریس ہائی کمانڈ انتخاب کے معاملہ میں جو ذہنیت رکھتی ہے اس کا حال کانگریسی صوبوں کی وزارتوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے کھل جاتا ہے۔ جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے، وہاں ہندو وزیر اعظم ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت ہے وہاں مسلمان کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی کٹّے سے کٹّا وطن پرست بھی اسلامی نام سے موسوم ہونے اور اسلامی سوسائٹی کے تعلق سے متہم ہونے کی بدولت وزارتِ عظمیٰ پر بار نہ پاسکا۔ حتیٰ کہ بیچارے ڈاکٹر سید محمود بھی اس شرف سے محروم رہے حالانکہ اگر ان کا نام محمود کے بجائے سنہا ہوتا تو یقیناً انکی وطن پرستانہ خدمات ایسی تھیں کہ وہی وزیر اعظم بنائے جاتے۔ اسکے بعد وزیروں اور پارلیمنٹری سکریٹریوں کی فہرست

اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں - بلکہ بعض جگہ تو تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لیے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ سیاسیات کے دائرے میں بھی خود متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے؟ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں وہ ہندوؤں کو، اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں وہ مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کر دیں، اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں -

(۴) متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری لادینی اسٹیٹ بنایا جائیگا وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کیلیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہوگا، مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اسکو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جارہا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں - اسکے لیے بھی میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کرونگا :-

۱- سی پی کی کانگریسی حکومت کے تحت تعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ۲۴ ستمبر ۳۸ء کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۲۴۴) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ ۲ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی تصویر کی پوجا کریں - یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو و مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی -

۲- اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمۂ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں

تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے - اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے - (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۰ جون ۳۸ء)

۳- ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ بندے ماترم گانے میں شریک ہونگے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائیگا - اس واقعہ کو بھی خود سی پی کے وزیر اعظم نے مذکورۂ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے -

۴- اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسے میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ مل کر سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام - اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۳۸ء)

۵- خود کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبۂ متوسط کو "مہا کوشل" سے موسوم کیا گیا ہے - گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آرہا ہے -

۶- مسٹر شریف، وزیر صوبۂ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے - انہوں نے ایک ایسے مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی - اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے انکو وزارت سے معزول کر دیا - مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۴ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے ان کو سی پی کی ہندو وزارت نے حکماً رہا کر دیا اور اس پر ڈسپلن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے، کسی باز پرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی - حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو (بابو سنگھ) کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائی کورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا

سی پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی سے کے مہتا نے رہا کر دیا اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

۷۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یوپی مدراس اور سی پی میں قربانی گاؤ کو حکماً بند کرنے، اور ہندی کو "ہندوستانی" کے پُر فریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی کے زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اس کے لیے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگ آزادی" کی منزل مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ انکی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے مسلمانوں کو آخر اتنا بے وقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے جنگ کرینگے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و ہوش ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائیگی؟

بنیادی حقوق

کہا جاتا ہے کہ اس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلیے وہ بنیادی حقوق (Fundamental rights) بالکل کافی ہونگے جنکا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان اہلِ انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس (Convention) نے وضع کیا تھا تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے، اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود معین کر دیے جائیں جنہیں توڑا نہ جاسکے۔ اسکے بعد امریکہ کے "اعلان آزادی" اور "اعلان حقوق انسانی" میں انہی حقوق کو بطور اصول عامہ کے درج کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامۂ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بنگیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ: قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں۔ کسی شخص کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کر سکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ قانون قذف (Law of Libel) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں راز داری قائم رکھی جائیگی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا

ہماری قومی زندگی کی بنا قائم ہے، اور اس نظام کو انہی بنیادوں پر قائم رکھ کر اپنے آپ کو جوں کا توں، یا کسی قدر تحفظ کیساتھ اس میں فٹ کرنے کی کوشش کرنا سراسر ایک غیر دانشمندانہ طریقِ کار ہے، اور مسلمان اس طریقِ کار سے ہرگز کسی فلاح کی، اور فلاح کیا معنی، اپنے بقار کی بھی امید نہیں کر سکتے ۔۔۔۔ اس بحث سے میرا واضح مقصد یہ ہے کہ خیالات، مقاصد اور پالیسیوں میں جو اشتباہ والتباس اور الجھاؤ اس وقت پایا جا رہا ہے اسے ختم کر دیا جائے، جو مختلف اور متضاد راستے اس وقت خلط ملط اور گڈمڈ ہو گئے ہیں ان کو الگ الگ کر کے دینِ قیم کی راہ اور طاغوت کی راہ کو بالکل ایک دوسرے سے ممیّز کر دیا جائے، اور لوگوں کو مجبور کر دیا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی راستے کو اپنے لیے منتخب کریں۔ جو وطن پرست ہیں اور ایک ہندوستانی قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت اور علیٰ رؤس الاشہاد اس راستے پر جائیں اور یہ سمجھ کر جائیں کہ یہ راستہ اسلام کے راستے کے خلاف جا رہا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کا نام لینا چھوڑ دیں اور اُس تحریک سے الگ ہو جائیں جو اسلامی قومیت کو وطنی قومیت میں تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ میں ان لوگوں کے موقف کو ناممکن الوقوف بنا دینا چاہتا ہوں جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ مخالف سمتوں میں جانیوالی کشتیاں ہیں ۔۔۔۔ سب سے آخر میں میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لیے اب صحیح قومی پالیسی کیا ہے اور اس کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو پورا جواب مل جائے گا جو اس غلط خیال میں خرص وتخمین کے تیر تکّے چلا رہے ہیں کہ میرے پاس محض سلب ہی سلب ہے، اثبات وایجاب نہیں ہے۔

جب لوگ موجود الوقت نظام کے پوری طرح خوگر ہو چکے ہوں تو ان کے لیے یہ

بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امن عام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ انتخابات آزاد ہونگے۔ پارلیمنٹ کے ارکان باز پرس سے محفوظ رہینگے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا الّایہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ ان کے علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہیں۔ یہ حقوق دراصل اس لیے وضع کیے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی شخصی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کیلیے کوئی قانونی بنیاد موجود رہے، جسکی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکے، یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور رہو۔ لیکن اوّل تو زمانۂ حال میں سیاسی تصورات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اُس حدبندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہو گیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور افراد رعیت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلان حقوق صرف اس صورت میں کام آسکتا ہے جب کہ جمہور قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کیلیے کھڑی ہو جائے۔ مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلانِ حقوق قطعی بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ثالثاً کراچی کے ریزولیوشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس اہم بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

(۱)

حکومت کے حدود عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور

انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور لوگ انکے استبداد سے نجات حاصل کرنے کیلیے جدوجہد کر رہے تھے اسلیے لوگوں کے ذہن پر حکومت اور رعیت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory) مستولی تھا یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز، اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اسی خیال سے نے اسٹیٹ کے حدود عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism) پیدا کیا جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے۔ اُسی کی حفاظت کیلیے فرد اُس معاہدہ عمرانی (Social Contract) میں شریک ہوتا ہے جسکی بدولت اسٹیٹ وجود میں آیا ہے۔ لہذا اسٹیٹ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے۔ جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا، انصاف کرنا، اور حدود مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اسکے فرائض ہیں۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کیلیے ہو، اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو، بہر حال ناجائز ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ عام خیال تھا اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست بھی بنادی تھی جو حکومت کے دائرۂ عمل میں آسکتے ہیں۔

یہ تخیلات اُس زمانے میں بھی قائم رہے اور کافی مدت تک چلتے رہے جب شخصی حکومتوں کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں۔ مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہوسکا کہ جمہوریت اور دائرۂ حکومت کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں۔ جب سوسائٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے تو وہ اپنے اوپر خود کس طرح پابندی عائد کرسکتی ہے، اور اسکو اپنے اوپر ایسی پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ اسٹیٹ

کو اسی لیے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر . . اور تنظیم کی طاقت سے اپنی ان اجتماعی ضروریات کو پورا کرے جن کے لیے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پھر آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کیلیے جائز اور بعض کیلیے ناجائز ٹھیرا لے ؟ اس حد بندی کی ضرورت تو اُس وقت تھی جب حکومت سوسائیٹی سے الگ . . . ایک چیز ہوتی تھی اور کہیں اوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی ۔ مگر جب خود سوسائیٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت ؟

فرد ، سوسائیٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظام جسمانی کی طرح سمجھنے کا یہ تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا ۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرۂ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں ۔ تمدن ، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اترتی جا رہی ہیں ، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں ۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا ، انکے لیے کام مہیا کرنا ، انکے معیار زندگی کو بلند کرنا ، اور انکے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا ، یہ ہیں اب حکومت کے فرائض ۔ ان فرائض کو انجام دینے کیلیے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کرنے پر مجبور ہے ، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے دائرے میں آجاتی ہے پھر وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کیلیے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کیلیے کار آمد بنا سکے ۔ مزید براں ان فرائض کی بجا آوری میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا انکی انفرادی خواہشات ، یا انکے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے ۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا

جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائگی میں حارج نہوں۔ جہاں وہ حائل ہونگے وہاں انکی انفرادیت کو پامال کردیا جائیگا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خودمختار ہوکہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی یا گروہی آزادی کا حق مسلم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کیلیے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے کر سکتی ہے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور فلاں طرز کا نہ پہنو، فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو، اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو، وعلیٰ جزا۔ اسی طرح جب تک وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو ایک اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کردے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جنکی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرادینا، شخصی املاک پر بمعاوضہ یا بلا معاوضہ قبضہ کرلینا[1]۔ باشندوں کی سکونت یا نوآبادکاری یا ترقی زراعت کیلیے اگر ضرورت ہو تو زمینوں کو بلا معاوضہ ضبط کرلینا[2]۔ موروثی جائداد اگر ایک حد خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کردینا[3]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[4]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی

---

[1] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳ بارۂ دوم۔ دستور پولینڈ دفعہ ۹۹۔ دستور چیکوسلوواکیا دفعہ ۱۰۹

[2] ایضاً دفعہ ۱۵۵۔

[3] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۴۳۔ ایستھونیا، لیٹویا اور لتھوانیا میں اس مضمون کے قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

[4] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۳۹۔

تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کیلیے اسکی حاجت ہو[1]۔

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اول تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے، کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کر سکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت ہی کا کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اسکا اقتضاء کیا ہے۔ لہذا اب اکثریت کے ظلم و جور اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اسکی قاہرانہ مداخلت کیلیے کھل جاتے ہیں۔ وہ اسکے تمدن اسکی معیشت و معاشرت اور اسکے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے، اور تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیکر اسکی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔

(۲)

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آسکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ باشندگان ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی گورنمنٹ ملک پر مسلط ہو گئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومت جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی اقلیت کے کام نہیں آسکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجیے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوئی ہے۔ ۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کیلیے چرچ آف انگلینڈ

[1] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۸۔

کے طریقہ پر عشائے ربانی لینا لازم تھا۔ ۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمایندگی سے محروم تھے۔ ۱۸۶۷ء تک یہودی پارلیمنٹ میں نہ جا سکتے تھے۔ ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کیلیے بند تھے جو پراٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں، اور ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۱ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کیلیے دفن اموات کے بارے میں طرح طرح کی قیود موجود تھیں۔ ۱۸۸۸ء تک عدالت میں شہادت دینے والوں کیلیے حلف کی ناروا قیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی اقلیت کیساتھ تو ۱۹۲۰ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جنکا تناسب کل آبادی میں ۹ فیصدی سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکیوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔ جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں۔ اور قانون میں کوئی چیز ایسی نہیں جسکی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ سفید فاموں کی اکثریت انکے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے۔ شہری حقوق تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کیے جا رہے ہیں اور دستور کے عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ گھس نہیں سکتے۔ انکے ہوٹلوں، ریسٹوران اور تھیئٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ انکی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کیساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا۔ سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ انکے بچوں کے ساتھ حبشی کا بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ انکے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر اباء نہیں کرتا، اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی

حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کیساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کیساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتہً ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اسکے بنیادی حقوق اور قانون اور اسکی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کیلیے نا اہل ہیں اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دیتا ہے، یعنی پھر وہ خدمتگار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اور اپنے روپے سے مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب سنہ ۱۹۰۵ء سے انکے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکن عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں۔ حبشی کیلیے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے سنہ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۱۷ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۵ مہینہ کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فی صدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فیصدی۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں ۲۴۴ تھے اور سفید فام ۹۶

سنہ ۱۸۹۰ء " " " " ۲۶۴ " " ۸۴

۱۹۰۴ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ہیں	۲۷۸	تھے	اور سفید فام				۷۷
۱۹۱۰ء	"	"	۳۸۴	"	"	"	۸۹
۱۹۲۳ء	"	"	۳۲۷	"	"	"	۷۷

اس طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے[1] مگر حبشیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کیلیے مقرر کیا گیا تھا جو Chicago Commission of Racial Relations کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کیلیے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کیلیے ناکافی سمجھی جاتی ہے"۔ ایک دوسرے جج نے کہا کہ "ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذ و نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے"۔ شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں، کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں۔ رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہیے ...... ایک ایک جرم میں بہت حبشی پکڑ لیے جاتے ہیں لہذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں ..... سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے"۔

---

[1] Encyclopædia Britannica. Article : Negros in America

[2] اس کمیشن کی رپورٹ (Negros in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ تو قانون کا حال ہوا - اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے اس کا کیا حال ہے ؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد "شہری" (Citizen) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے - سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے گویا بند ہیں - آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا - البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کیلیے وہ ضرور بھیجے گئے تھے اور اب بھی اس کام کیلیے تیار کیے جا رہے ہیں -

عامۃ الناس ان کو صرف ملیچھ ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے - ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ شکاگو میں یکایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اٹالین لڑکی کو مار ڈالا ہے - اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا - کارونر کی عدالت میں جب اسکی لاش پیش ہوئی تو ۱۳ گولیاں اسکے جسم سے نکلیں، کھوپڑی چور چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے - بعد میں معلوم ہوا کہ اٹالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی - پریزیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں کے مظالم پر محاکمہ فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا - امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynching) کہتے ہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دیدیں - اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے، چنانچہ "نیویارک ورلڈ" نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۲۰۵ حبشی بر سر عام لنش کیے گئے - لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جائے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جائے - لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی

وقت آمادۂ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute) ہوتا ہے، اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے، بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بدمعاشی کرنا اسکی سرشت میں داخل ہے۔ گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات کی زبان میں وہ ایک پیدائشی "غنڈا" ہوتا ہے۔ لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کرکے ثابت کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے، اور صاحب لوگ خود اپنی قوم کی عورتوں پر اور کالی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بے باک ہیں حبشی غریب اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ البتہ حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت اور اشتعالک کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور مچ جایا کرتا ہے اور یہی حبشی کے بدنام ہونے کی اصلی وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں، البتہ سفید فام بہت سے آئے۔ ایک دوسرے جج نے بیان کیا کہ میری کل مدت ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہوکر آیا ہے حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے جسکا نام کوکلکس کلاں (Ku Klux Klan) ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلہ (Negro Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے[1]۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ تر طاقتور سنگھٹن ہے جسکے ارکان کی

---

[1] ۱۸۰۰ء سے ابتک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فیصدی اضافہ ہوا ہے اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فیصدی کمی ہوئی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہیگا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس نظام میں اصولی خرابیاں کیا ہیں، اور یہ کہ اسکے اصولوں سے مختلف بھی کچھ اصول ہو سکتے ہیں جن پر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے۔ اس لیے میں جانتا ہوں کہ اُس توضیح و تشریح کے باوجود جو میں نے موجودہ نظام پر تنقید کرنے اور جدید تعمیر کا نقشہ کھینچنے میں اختیار کی ہے، بہت سے نکات ایسے باقی رہ جائینگے جن میں لوگوں کو الجھن پیش آئیگی۔ میں خود بھی اپنا تمام وقت ان کو سمجھنے میں صرف کر رہا ہوں، اور اپنے ناظرین سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس مجموعہ کو ملاحظہ فرماتے وقت وہ نوٹ کرتے جائیں کہ کون کون سے مقامات توضیح طلب ہیں۔ اگرچہ میں گالیاں دینے والے حضرات کا بھی شکر گذار ہوں کہ وہ بھی میری اخلاقی تربیت میں مفید حصہ لے رہے ہیں، مگر میں اُن حضرات کا اور زیادہ شکر گذار ہونگا جو میرے ان مضامین پر تحقیقی تنقید فرمائینگے۔

ابوالاعلیٰ

۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ

تعداد سنہ ۱۹۲۳ میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائیٹی والے اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں۔ صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کر جاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ جیل کی کوٹھریوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ (America Comes of Age.) کا مصنف لکھتا ہے کہ "وہی مہذب شائستہ جنٹلمین جس سے آپ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کر کے آیا ہو اور اسکے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت وافتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔" چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹیکساس Texas کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ مجرموں میں ایک تو پادری صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ایک حبشن کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے، رسیوں اور خاردار تاروں سے اسے باندھا، ہنٹر مار مار کر اسکی کھال ادھیڑی، پھر اسکے زخموں پر کریازوٹ چھڑک کر چل دیے اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشن اور اسکے لڑکے کو پکڑ لے گئے اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اٹھا لے گئے اور اسکو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک سیاہ فام [illegible] کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ حبشی کا سب سے بڑا قصور [illegible] معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

ل یہ واقعات رسالہ "نیو ایج" [illegible] ہوئے ہیں۔

یہ ہے کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اسکے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۸ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے۔ ایک حبشی بنیکر (Binga) کے مکان اور دفتر پر ایک سال کے اندر ۶ مرتبہ بم پھینکا گیا، صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لیے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے، اسکے بنیک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے، اور اسکی بدولت حبشی لوگ جائدادیں خریدنے لگے ہیں — یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۷۹۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی کا ۱۹ فی صدی حصہ تھے وہ آج ۹ فی صدی رہ گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔ جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رو سے تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق مسلّم ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کیساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کیلیے جرمنی کے حدود میں عزت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہوگیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کرسکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جا رہا ہے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ کھلم کھلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کیلیے انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کردے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابل برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کیلیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آسکیں۔ انکے والدین اگر ان سے ملنے کیلیے باہر جانا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دیجاتی ہے اور مہاجر کیلیے یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس

لہ تفصیلات کیلیے کتب ذیل ملاحظہ ہوں:

J. E. Cutter, Lynch Law. C. G. Woodson, The Negros in Our History E. B. Reuter, The American Race Problem.
M. J. Hersk... Th... Am... Neg...

فیصدی حصہ جرمنی سے باہر لے جاسکتا ہے ، باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کونسا ملک ایسا ہے جسکے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں ؟ اور کونسا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو؟ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بنیادی حقوق مقرر کر دیئے گئے ، مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کر دے یا پھر اسے شودر بنا کر رکھا جائے اور مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلیویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے اور اسے آٹانومی دیدی جائے۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ سربوں نے ان کو کیا جواب دیا ؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سن لیجیے :-

"سرب ، کروٹ اور سلافینی درحقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ بیرونی جوا ہمارے کندھوں سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس فتح یاب ہو کر ابھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حدبندیوں کو توڑ دیا ہے جو سیاسی ادارات اور زبان اور مذہب نے پیدا کر دی تھیں۔ وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم جسکے ذریعے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا ، منسوخ کر دی جائے۔ مقامی نظم و نسق کیلئے صوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہیے تاکہ یہ صوبے نسلی حلقوں کی حدبندیاں (Racial Groups) نہ بنا سکیں۔"[1]

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے ہیں ؟ یہ گویا ایک قاعدہ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جو شیلا وعظ وہی قوم کہا کرتی ہے جسکا سو فی صدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے۔ اور وہ بے وقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں "ایک قوم ایک

[1] A. H. Morley, The New Democratic Constitutions of Europe

ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں، مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدھے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا بے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم ـــــ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورۂ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمایندے احتجاجاً اسمبلی سے اٹھ گئے اور انکے جانے کے بعد سربی اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا جو وہ پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بے وقوف بنایا"!

(۳)

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھیے جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کیے گئے ہیں اور جنکی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے، اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلیے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں ــــ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ اصول جمہوریت کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اسکو نافذ کریگی۔ لہٰذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عامہ اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ــــ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا

اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہمکو دے رکھی ہے، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہو کر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً ناآشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائینگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہو کر خود بخود آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرینگی۔ یہ آزادی محض ایک افیون ہے تاکہ اسکی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لیکر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں انکے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں انکی گردن پر چھری رکھ کر زبردستی کلمۂ کفر نہیں کہلوایا جائیگا۔ مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ انکی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دیجائیگی۔ اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپکی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا

رہنے دیا جائیگا کہ اسلام ہی سچا دین ہے، اور تمام مذاہب سے برتر اور اصلح ہے - مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لیکر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہو لیں - ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو معقولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے - ہم تو استقلالِ وطن اسیلیے اور صرف اسی لیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں - اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی -

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی ـــــ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے - اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں - درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا - باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یو - پی کے وزیر تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے، کہ انکا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے، تا کہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے - ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے - اس نے بھی ہمکو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنیکلر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں - لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی - اگر یہی حالت اُس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اسلیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اُس طرح غذا دے سکیں جسطرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کرلینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی کیا ضرورت ہے؟

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا ـــــ یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنیکا قانون پاس کر دے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اسیطرح مذاق اُڑائے جسطرح ابھی چند روز ہوئے سٹرداس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جاچکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہوسکے ـــــ اس دفعہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبۂ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنووں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے ـــــ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، اگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجاکر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جنکے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنیکے لیے جنگ کریں، جسکی پالیسی کی تشکیل، جسکے قوانین کی تشریع اور جسکے احکام کی تنفیذ میں ہم واحد قومیت، اور اصول جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اسلیے حاصل کی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابن فرعون اطمینان دلاتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی!

جنگ آزادی کی نوعیت

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جسکو "جنگ آزادی" کہا جارہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے، یا نیم انقلابی اور نیم دستوری ؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کیلیے جنگ کی جائے، اور جب تک اسکا تختہ الٹ نہ دیا جائے، اسوقت تک ملک کے نظم ونسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رو کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ اسکو قطعی طور پر منہدم کرکے دوسری عمارت بنانا چاہتے ہوں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر نظام حکومت میں ترمیم و اصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کرکے کچھ مزید اختیارات حاصل کیے جاسکیں، اور اس طرح بتدریج پرانے نظام حکومت کو ہٹا کر نیا نظام حکومت اسکی جگہ لیتا چلا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں دو ایسے فریق بھی

مل کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظام حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظام حکومت کس نقشہ پر بنایا جائے۔ انکے لیے یہ ممکن ہے کہ تعمیر نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اٹھا رکھیں۔ وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ، ہم متحدہ قوت کے ساتھ پہلے اس نظام حکومت کو ختم کردیں، اسکے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لینگے، یا پھر بدرجۂ آخر قوت آزمائی کر دیکھینگے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقتور ہوگا اسکی مرضی کے مطابق نیا نظام حکومت بن جائیگا لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں تو فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو۔ اس لیے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اسکا ساتھ دیتا چلا جائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کیساتھ ساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا جاتا ہے اور اپنی آزادی کے سوال کو اس وقت کیلیے اٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ اُس عقلمند فریق کیلیے تو ضرور جنگ آزادی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اُس بے وقوف فریق کیلیے یہ دراصل جنگ غلامی ہوگی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کیلیے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی تو ہم اسکی کوئی پروا نہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ پنڈت جواہرلال اور سوباش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں اور بھولا بھائی ڈیسائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے۔ ہم بہادروں کیطرح ان سے کہتے کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آئیے، پہلے ہم اور آپ مل کر اس بد اصل عمارت کو توجڑ سے اکھاڑ پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر

مسلمانونکی غلط نمائندگی اور اسکے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں، اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں، جسکو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے، اپنے شایان شان حصہ نہیں لیتے، ایک ایسا معمّا بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کیلیے نہیں، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کیلیے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر، خود اسکی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اسکی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کیے جاتے، اس اصل مسئلے کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کیلیے زندگی و موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے، اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل کے رجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس معمّے کو سمجھنے اور مسلمان کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی

کردیا ہے۔ اسکے بعد ہم دیکھ لینگے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل (بیرونِ سایۂ سلطنت برطانیہ) کیلیے انقلابی لڑائی سے منہ پھیر تا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورت حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے، اور منزل مقصود ٹھیرائی جاتی ہے کینڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی (یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر)۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہی نیم انقلابی نیم دستوری جسکا مفہوم اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کیلیے ہرگز تیار نہیں ہیں، اور انکے مسلط کیے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لیے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنا دیا ہے اس کو عملاً قبول کر کے حکومت کے نظم و نسق کا چارج لے لیا جاتا ہے اور خوب دل لگا کر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب پُر فریب طلسمی جال تیار کر دیا گیا ہے جسکے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادر زاد اندھوں کے سوا ہر ایک اسکو دیکھ سکے۔

(۱)

آزادی کامل، (پورن سوراج Complete Independence) کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور وہی آزادی ہونی چاہیے جو فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ یہاں اصرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے، لیکن اگر انکی تعبیر بیرونِ سایۂ حاطفت برطانیہ کے ساتھ کر دی جائے تو مہاتما گاندھی بران دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جسکو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب و مقصود ٹھیرایا گیا تھا، یعنی برطانوی دولت

مشترکہ میں خود مختار نو آبادیات کی سی حیثیت - مگر اب اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اسکی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آئے، اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے۔ تاہم انتہائی سعی اخفا کی باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آہی جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوبھاش چندر بوس نے فرمایا ہے:

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا ..... برطانیہ عظمیٰ کیلیے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کر دے"

ابھی حال میں پنڈت جواہرلال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اسکے لیے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو جلدی سے جلدی اور بالکلیہ ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا بلکہ یہ ممالک اسکے طاقت ور مددگار بن جائینگے"۔ (نیشنل ہیرلڈ بحوالہ نیشنل کال مورخہ ۱۰ ر نومبر ۱۹۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ:

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹربیون مورخہ ۱۹ ر اگست ۱۹۳۸ء)

ٹربیون ہی کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

یہ کانگریس کے اُن دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک اسوقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا بھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے۔ ان کا مطمح نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اُس دائرے میں جگہ پالے جسکا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جسکا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر، خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو ـــ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے، اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادیٔ کامل بول کر آزادیٔ کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش، جو فطرۃً ہر خودار ہندوستانی میں ہونی چاہیے، انکے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اسکی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت (Open and Fair Competition) کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اسکے لیے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض انکی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دیکر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کردیں، یا جب تک وہ انکی سائیسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکار انکی پشتیبانی کیلیے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے تو اندر سے وہ درجۂ نوآبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصلی مدعا یہ ہے تو آخر یہ آزادیٔ کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نوآبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟

خصوصاً وہ لوگ جنکے ایمان میں اھنسا سے بھی پہلے ستیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گذشتہ دس سال کی تاریخ پر غور کرنے سے مجھے ملا ہے اسے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجۂ نوآبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں دوہری مشکل پیش آتی ہے۔ اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل ہی میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے، اور اگر اپنے اصل ارادے بے نقاب کر دیئے جاتے ہیں تو پھر اس دام فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جس میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگان وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائیگا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو تو دریائے راوی میں غرق کر کے "آزادی کامل" کا اعلان کر دیا، اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد، یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی۔

اگرچہ جاننے والوں کیلیے یہ راز اُسوقت بھی راز نہ تھا۔ اور جنکے پاس کچھ عقل تھی انکے لیے اسکے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اسکے چہرے سے نقاب اٹھتا رہا۔ مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لیے نہ گئے تھے، نہ کامل آزادی دینے کے لیے ان کو بلایا گیا تھا۔ ....

......اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنیکا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اسکے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کیلیے

راز ہی رہا اور آج بھی جبکہ برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے ، انکے لیے یہ بدستور راز ہے ، چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ ہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں ، اور ماس کانٹیکٹ کے جال میں مسلمان تو کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کیلیے ہے ـــــ یہ فائدہ ہے اس منافقت کا جو ستیہ اور اہنسا کے معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے ۔

(۲)

جب آزادیٔ کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے ، یعنی ہم اس ظالمانہ نظام حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور جب تک وہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے ، اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کیلیے تیار نہیں ہیں ۔ بات بظاہر نہایت معقول تھی ۔ کیونکہ آزادی کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آگیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادیٔ کامل ہی کا حصول ہوگا ۔

اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوگیا اور جدید اسمبلیوں کیلیے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائیں گے مگر اسلیے کہ اس دستور کو اتار کر توڑ ریں ۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا ۔ کچھ مدت تک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کی قلمدان بھی سنبھال لیے گئے ۔

جب وزارتیں بھی قبول کرلی گئیں تو کہا گیا کہ اس سے مقصود ہزمیجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستور جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے ۔ چنانچہ عہد قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا وہ یہ تھی کہ :

" دستور جدید کا مقابلہ کر کے (یا اسکی مزاحمت کر کے) اسے ختم کر دیا جائے ۔ ووٹروں کی بڑی اکثریت نے کانگریس

کی اس پالیسی اور اسکے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے۔ عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر آئین جدید کو نامنظور کر دینے کا اعلان کر چکے ہیں (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے)۔ وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستور حکومت خود بنانا چاہتے ہیں...... لہذا باشندگان ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو از اول تا آخر مسترد کرتی ہے ...... کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مجالس قانون ساز میں ان کا کام اس دستور کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے .... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت برطانیہ کیلیے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائیگا ...... اسی پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جنکی مجالس قانون ساز میں ان کو اکثریت حاصل ہے۔"

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی زبانوں سے سن لیجیے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:

"چند مہینوں کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں کر سکی تھی" (ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۲ر فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کارآمد بن گیا! اور سنیے۔ کانگریس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس فرماتے ہیں:

"کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتقاد نہیں رکھتی بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار کو انسب سمجھتی ہے" (ٹریبیون مورخہ ۱۵ر جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے قضیۂ وزارت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت کو چلانے کیلیے ہے تو وہ کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گیا، درانحالیکہ کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کیلیے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اسکو چلانے کی پالیسی علانیہ اختیار کی جاچکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جا رہی ہے۔ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو انکے لیے بہت آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کیلیے ایسی تدابیر اختیار کرتیں جنکی اجازت دینے سے گورنر انکار کر دیتے، اور پھر اس پر استعفے دیکر آئینی انقباض (Deadlock) پیدا کر دیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کیساتھ اس دستور کو اسی طرح چلا رہی ہیں جسطرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کر رہی ہیں کہ گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے خواہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وہ بہت سے کام رہ جائیں جنکا انہوں نے وعدہ کر کے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔

انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کمی کر دینگے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی ؟ یوپی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دیدیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کر چکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ صرف اسلیے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اُس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جسکی وفادارانہ خدمت انجام دینے کیلیے یہ حضرات ایوان وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کرینگے۔ مگر کون صداقت پسند

[1] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۱۳ جولائی ۳۸ء۔

آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ احمد آباد، شولا پور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ مختلف ہے؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب مزدور اگر اپنے حقوق تسلیم کرانے کیلیے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بے تکلف فرماتے ہیں کہ "کارخانہ دار انکے خلاف پولیس سے امداد طلب کرنے میں اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں"[1]۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائینگے جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں، اور باشندگان ہند کو انکی کھوئی ہوئی مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائینگے۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ کیا وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کیے تھے؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانہ میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے؟ وہی کانگریسی جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ چلاتے ہیں اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپٹ اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ شولا پور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے، حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کیلیے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جسطرح پہلے تھا۔ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ، جسکے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف اسکو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کیلیے اسے استعمال کیا گیا، اور مدراس

---

[1] ہریجن۔ مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء۔

میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر آج پوری آزادی کیساتھ اس سے کام لیا جارہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جسکی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اسکی خدمات سے پورا فائدہ اٹھارہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کیلیے نہیں بلکہ چلانے کیلیے نکلے ہیں) تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جسکو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جارہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور ایڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کیے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کردے[1]۔

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی، مسٹر ایم این رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنیکے بعد، خصوصاً وزارتیں قبول کرنیکے بعد کانگریسی سیاست تیزی کیساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کررہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہوگئی ہے"[2]

"کانگریسی وزیروں نے امپیریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جو جنگی مورچے (Strategic Positions) انکے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ

---

[1] تفصیلات کیلیے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۳۷ء۔ نیز ٹریبیون کا مقالۂ افتتاحیہ، ۲ اگست ۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ جولائی ۳۸ء۔

[2] ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء۔

کرنے کیلیے انہوں نے استعمال نہیں کیا - وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے بلکہ اسکی ہدایت کے تحت اسی امپیریلیسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے وہ گئے تھے۔

"ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کیلیے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکینگی"[۱]

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشہ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا جائے۔ بلکہ نقشہ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظام سلطنت کے اندر رہ کر حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کر کے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات مل سکیں۔ اسکے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق، جسکی تشریح میں آگے کرونگا، ملک میں اتنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کریں چنانچہ آج کل اسی غرض کیلیے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیر ہند سے ملاقاتیں فرما رہے ہیں، ستیہ مورتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں، اور سوباش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کیساتھ کر رہا ہے، اور سب کی منزل مقصود ایک ہے، یعنی ہندو راج زیر سایہ برطانیہ۔

[۱] نیشنل کال مورخہ ۱۳ جون ۱۹۳۸ء -

کی، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے کرنیکا ہے جنکے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں، اور اسکے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اُسکی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحب علم وصاحب فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے، اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نااہل اور ناقابل اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے، اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کیلیے فی الواقع کونسا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے، محض چند سطحی اور حقیر سے جذبات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے بہت زیادہ زور دیکر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے، کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے، تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کا

(۳)

یہاں پہنچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں گو انکے نام اور کام مصلحتاً جدا جدا ہیں۔

نظری حیثیت سے تو دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علم بردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں" (قوموں) کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علحدگی کے ہر رجحان ( ) کی دشمن ہیں حتیٰ کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کا نام تک سننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات و حسیات غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہاسبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے، مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے اسے حاصل کریگی۔ بخلاف اسکے ہندو مہاسبھا کہتی ہے کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائیگا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرو۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریت کے اُنہی تصورات کو درآمد کریگا جو اسکے اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ چاہے لڑا کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کیلیے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے، مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کریگا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکیگا جو اسکے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو۔ لہٰذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات

ملینگی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ انکی عددی اکثریت کے سیاسی قوت و اقتدار کا مالک بنائیگی۔ اور اس قوت و اقتدار کو اگر ہوشیاری کیساتھ استعمال کیا جائے تو معاشی دباؤ، تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جا سکتی ہے، لہٰذا جب تک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے "آزادی کامل" کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کیساتھ دشمنی کرنا ہے۔

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہاسبھا میں رہا۔ مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آگئی ہے جہاں ہندو مہاسبھا تھی۔ اور دونوں مل کر سامراج کے تحت ناظم (Administator) کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ بہار میں، سی پی میں، یوپی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہاسبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر دیسمکھ بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی موقع پر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ایک وفد لیکر لندن پہنچے تھے۔ سی پی کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنہوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنہوں نے بعد میں کمیونل ایوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کر کے اسکو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا۔ سی پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہاسبھائی ہے۔ کانگریس کیطرف سے اسمبلی کی صدارت کرتا ہے اور مسٹر ساورکر سے مل کر حیدرآباد میں ریاست کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے۔ بہار میں جاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہاسبھائی پارٹ ادا کیا۔ یوپی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات ان مہاسبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "قومیت متحدہ" کی خدمت کرنے والے حضرات

کس آسانی کیساتھ کانگریس سے مہا سبھا میں اور مہا سبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ان دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہا سبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہا سبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جاکر ماس کانٹیکٹ کرسکتی ہے نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کرسکتی ہے۔ نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کرکے یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ یہ "قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہدنامہ (Agreement) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائیگا۔ نہ اسکو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہوسکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیرکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اسکے آستانہ پر جھکا دیں نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی خدمات میسر آسکتی ہیں کہ واردھا اسکیم تیار کریں۔ نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۰ فیصدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فیڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت ( ) کا تابع بنا دیں جسکے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علمائے کرام کی خدمات حاصل کرسکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اسکے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتوے دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اسکے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اسکے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں۔ نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کیساتھ کراسکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے۔ نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اسکو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہوسکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان پکڑ کر نکال دے۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آسکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہا سبھا نہیں،

انڈین نیشنل کانگریس ہے۔

اس فرق کیساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنیوالی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے۔ اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج کو حسب ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمتہ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

(۴)

ہندو مہاسبھا کیساتھ ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس قیصریت کا فوری کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے۔ برعکس اسکے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے۔ یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کیلیے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کیلیے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں کہ اسکی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کیساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہذا جسطرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا اسیطرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے ان کو بھینٹ چڑھا دینا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی

بنا پر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سوداگرانہ معاملہ ہو رہا ہے۔ صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے، اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے۔ یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں۔ اسکے ساتھ ابھی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے اسلیے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی کرنے کیلیے تیار نہیں ہیں۔ تحفظات کی رسی انہوں نے انکے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کیساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں۔ اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کیلیے بڑھتے ہیں تو وہ اطمینان کیساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کیلیے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیئے گئے ہیں ان کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش (گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" (Gentleman's agreement) سے جو انکے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کر کے انکی گوشمالی کیجا سکے۔

(۵)

اس ملی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جا سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے دستور حکومت میں ان سب کی حفاظت اچھی طرح کر لی گئی ہے، اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کر کے حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہیں ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگ آزادی" کا اطلاق ہو سکے، کیونکہ "جنگ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی

نیچے گرائیں، بہرحال اسکا منشا یہ تو ہونا چاہیے کہ جہاں باشندگان ہند کا مفاد سرکار برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہوتا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی "جنتا" کے مفاد کو ابھارا جائے مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اسکی پابندی قبول کرنیکے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خودبخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کا دعویٰ لے کر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لیے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مصر ہے؟

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کرینگے تو یہ حقیقت آفتاب کیطرح نمایاں ہو جائیگی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اسکے سوا نہیں ہے کہ پراونشل آٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں انہیں جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل آٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فیڈریشن والے حصہ کو بھی باہزاراں عشوۂ و ناز آخر کار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائیگا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کرونگا اور تفصیل کیساتھ بتاؤنگا کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے اور اسکے نتائج کیا ہیں۔

(۶)

دستورِ جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کیلیے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلس قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصتہً اسی کی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت، حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمران

جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائیگی، اور جس تجویز یا مسودۂ قانون کو چاہیگی مسترد کردیگی۔ پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہوگا، کیونکہ حکومت کا نظم ونسق کلیتہً اسی وزارت کے ہاتھ میں رہیگا۔ جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اس صورت سے داخل ہوسکتے ہیں کہ پارٹی کے عہدنامہ پر دستخط کریں اور اُسکے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائیں۔ پھر جب وہ اسطرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہوجائینگے تو انکے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز پیش کریں جسکی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو، یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں۔ انکو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر وہ آزادیٔ رائے استعمال کرنا چاہینگے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا۔ نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اسکی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کرا سکتے جب تک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنالیں۔

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی اور تنفیذ قانون دونوں سے بے دخل کردیا گیا ہے۔ اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کیلیے کوئی قانون بنوا سکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں، اور نہ قوانین کو نافذ کرنیوالی مشین، یعنی وزارت میں ان کا کوئی پرزہ شریک ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہوجائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق وسلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اسکے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کرسکتے تھے وہ بھی چھن جائے۔ رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اسکا کوئی موقع نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم ونسق سے بے داخل ہیں اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں دراصل مسلمانوں کی جماعت

کو بحیثیت جماعت کے حکومت میں حصہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے نوکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جا سکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھیے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمہ دار وزراء کی نہیں ہے۔ کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جسکو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں اُن مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے انکو منتخب کیا، مگر کل مسلمان ووٹروں میں انکے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ وزارت میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، انکی اکثریت حکمراں ہے، کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ انکی پشت پر کوئی طاقت نہیں جسکے بل پر یہ کوئی بات زور کیساتھ کہہ سکیں۔ بخلاف اسکے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون ساز کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بےچارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان انکی مدد پر موجود ہیں تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اسطرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے، اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا، درانحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بددیانتی کی اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا[1]۔ اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اسی قسم

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۲۵ رجون ۳۸ء۔

کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلا کسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی[1]۔ پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن، اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہکر رفع دفع کر دیا تھا کہ:

"کانگریس بہرحال معمولی انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جسکی وہ نمائندگی کر رہے ہیں[2]"

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کیساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جبکہ انہوں نے کھلم کھلا خدایان کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کیطرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

(۷)

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخاب ہے کیونکہ اسکی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دور کرنے کیلیے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۱۹ جون ۳۸ء

اس "شریف آدمیوں کی سی قرار داد" پر پوری طرح اعتماد کرنیکے لیے تیار نہ تھا جو اسکے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی، اسلیے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اس نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونیکے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے، یعنی کانگریس براہِ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرالائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹرشپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس کے اوپر ہائی کمانڈ کے غلام بنکر رہیں، جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اس طرح بیٹھیں اور جس طرح اٹھائیں اس طرح اٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کیطرف سے بے چون وچرا منظور کرلیں، اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کیلیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتما جی یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ اس خدمت کو کوئی خاں صاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں۔ اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے۔

اگر یہ چیز کامیاب ہوجائے اور مسلمانوں کے حلقہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کرا سکے، اور جو مسلمان اسکے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقع پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہوگیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقۂ انتخاب میں اسکو شکست دیگی اور اس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرالائیگی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے۔ ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچ کر رہیگا اگر اس کی تائید میں ہمارے علمائے کرام چندسال اور اسی سرگرمی کیساتھ کوشش کرتے رہے۔ پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکیگا تو اسکو واپس لانے کیلیے بخاری شریف کا ختم پڑھا جائیگا۔

مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہوگئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپیریلیسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادی وطن کے مسئلے سے بڑھ کر ہم کو اسکی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان وقلم پر تھیں — یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے — یہ جادو عوام سے گذر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہورہے ہیں جنکا اصلی فرض یہ تھا کہ جانشینان رسول ہونیکی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے، اور جانشینان رسول ہونیکی حیثیت ہی سے اسکو حل کرنیکی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند ارباب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں اور جنکا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، مہر خاموشی نہ توڑینگے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کرینگے، تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپکو بڑے خطرے میں ڈالنا ہے کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سننی پڑینگی اور انسان کیلیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دلشکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جنکی بھلائی کیلیے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی ذات کے مفاد سے بڑھ کر اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انھیں ہر بُرے سے

(۸)

اسکے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ سوان کے لیے اجتماعی ماہی گیر (MASS - CONTACT) اور انفرادی صید افگنی (INDIVIDUAL CONTACT) دونوں سے آج کل کام لیا جارہا ہے۔

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خواب غفلت میں مبتلا تھے اسکے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ جدید آئین کے نافذ ہونے پر جب اسمبلیوں کیلیے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرتی اور مسلمان رائے دہندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دے کر ایسے نمائندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص، اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے۔ جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الکشن لڑائے۔ جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بنا کر کھڑا ہو گیا، اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا۔ قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اُسکے پاس نہ اُسکے پاس۔ ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت وجاہ۔ اسطرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے، اور انکی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا رنگ رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہو گئی۔ ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈی پنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے۔ انڈی پنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مرغ باد نما کے ہیں۔ یہ کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لے کر نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا موقع دیکھے اُدھر چلا جائے۔ عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغان باد نما سے پوچھا اور نہ اُن جتھے بند لیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟

آپ نے پہلے ہماری قوم کیلئے کیا کیا اور اب کیا کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اسکے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑینگے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے؟ چاہے وہ خرتا شخص ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس قومی حماقت کا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہو سکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی اور ایک بنیانِ مرصوص بنکر جم جاتی۔

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کیطرف دیکھا اور انکی کمزوری کو بھانپ لیا۔ انکے لیے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسر پیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جا سکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کیساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرا دی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کیطرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا ہماری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسماعیل شہید کی جانشینی کی متوقع تھے، جو کبھی اسلامی نظام جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا، جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جسکی زبان سے ہم کبھی ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم

للذئب[1] پرورش مواعظت سنا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ ''جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔'' مسلمانوں کی بدقسمتی کہ بالآخر وہی امت کے پراگندہ سروں سے چوسر کھیلنے نکلا اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کی ذلت کا یہ تماشا دکھلایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ انکو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے اور کس بے شرمی کیساتھ یہ لیلائے وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اُس پارٹی میں اور اُس سے اس میں منتقل ہوجاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدّتِ الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی انکو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ انکے منافقات سے فائدہ اٹھا کر یا اس کا ٹکٹ کے ذریعہ سے انکے بڑے حصہ کو شدھ کر کے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہو گئی (اور کیوں نہ ہوگی جبکہ آج ہماری قوم اٹھارویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کیساتھ اپنے فاتح خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھیے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہوگا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہیگا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہوگا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائینگے، ذرا ذرا سے قصور پر انکو پکڑ بلایا جائیگا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیے جائینگے، اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر انکو ایوان وزارت سے باہر کر دیا جائیگا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اسدرجہ بے بس ہوں، اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پر آونشل اٹانومی حرف غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمراں ہو گئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

---

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ: ''تفرقہ سے بچو کہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیے کا حصہ ہوتی ہے''

صوبۂ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کیلیے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ۹۵ فیصدی مسلم اکثریت ہے وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو سمجھنے اور سرحدی پٹھانوں میں نافذ کرنے کیلیے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں۔ سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنیکے لیے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائینگی، اور ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائیگا۔ اس نیازمندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیر اعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پاکر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں تو ہندو مہاسبھا انکے خلاف شورِ محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگریس ہائی کمانڈ اسکی بازپرس کیلیے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے۔ اسکے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ سڑک سیدھی ہندو راج کو جا رہی ہے، اسکے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اُسے آنکھیں دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۶، ۷ اور ۸ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنیسے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانیکا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اسکا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جسقدر سیاسی طاقت برطانوی قیصریت سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو وہ براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہونگے۔ اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں انکی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنالیا جائیگا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ انکی اپنی کوئی علحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ (BODY POLITIC) میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصول جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر ... کی حیثیت بہرحال غالب اور فیصلہ کن رہیگی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانیکے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہونگے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر ہونگے اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائیگی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی ...

---

۱ نیشنل کال مورخہ ۲۰ر جون ۳۸ء و ٹریبیون مورخہ ۲۲ر جولائی ۳۸ء

دہی ہوگی جو مجموعہ کی ہوگی، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سر شماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقار کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لیجانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اسکا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقار کا رخ اپنی منزل کیطرف پھیرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اٹھیگا اسی منزل کیطرف اُٹھیگا، کیونکہ اس مرحلہ پر انکی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح انکے ہاتھ میں آجائیں۔ اسی لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو نامنظور کرنیکا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کر لیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں یہ چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجیے کہ بڑی ہی اچھی طرح حکومت کی۔ مگر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھ میں دیدی جائیں؟ سوال ان اشخاص کا نہیں ہے جو آج برسر اقتدار ہیں بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے۔ جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمراں بنجائے، اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف واختیار میں چلی جائے، ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہوگا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہیگا

(۹)

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے ملک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور پھر وہ تمام ملک کیلیے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے، کہ اس قومیت اور اس تہذیب و تمدن کی شکل اسی برسر اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہوگی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور ...

... قومیت کا رنگ اس میں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائیگا یہاں تک کہ بالکل تحلیل ہو جائیگا۔

نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کیساتھ انصاف کی کوشش کیجائے

کانگریس نے اقتدار حاصل کرنیکے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے تو آپکو خود نظر آجائیگا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کیلیے کوئی جگہ نہیں۔

سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجئے[1]۔ یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ اس اسکیم کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائیگی[3]۔ لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجیے۔ جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہوگی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیمی میں شریک ہونے سے روک سکیگا اور نہ کوئی دوسرا انتظام تعلیمی ایسا موجود ہوگا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہیے کہ جس عمر میں اسکی آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آجاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اسکے دائرے سے باہر رہیگا وہ مادّی کامیابی کے مواقع سے محروم رہیگا۔ تاہم اس میں آدمی کیلیے یہ اختیار باقی تھا کہ اگر اس محرومی کو قبول کرے تو اس نظام تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہو جائے لیکن وردھا اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کیلیے سپرد کر دے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھیے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہمکو اس قسم

---

[1] میرے پیش نظر وہ اردو رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی موجود ہے (BASIC NATIONAL EDUCATION) کے نام سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں زیادہ تر اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دونگا۔

[2] جامعہ صفحہ ۱۱۱

[3] جامعہ صفحہ ۱۳۱

کے فقرے ملتے ہیں:

"(مہاتما گاندھی نے) اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالینگے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے" (صفحہ ۱۱۲)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے" (ص ۱۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اسکی قیمت سمجھا سکے" (ص ۱۲۵)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا انکی کوئی اور قومیت بھی ہے۔

(۲) شدھ ہندوستانی بن جانیکے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو۔ ہر علم اسکو اسلیے سکھایا جائے، اور وہ اسی لیے اسکو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت دونوں مترادف المعنیٰ الفاظ ہیں۔ پوری اسکیم پر تعلیم کا مادّی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اسکے زیر اثر جو نسل پرورش پائیگی وہ مادّہ پرست بنکر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہوگی۔ ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کریگی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جسکی آمدنی سے استادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ نکل آئے۔ دوسری طرف پورا نظام تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کریگا کہ کمانا اسکی زندگی کا اولین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے۔ تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری مثلاً زراعت یا نوربافی یا لکڑی یا دھات

کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھما دیا گیا ہے - اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیش نظر ہیں - ایک یہ کہ :

"ہر سمجھ دار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیئے" (ص ۱۱۴)

"یہ اسکیم اسلیے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنیوالے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (ص ۱۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (ص ۱۲۵)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ :

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اسکا ذمہ لینا چاہیے کہ اپنے ہونے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خریدے گی ...... ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں - اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانیوالوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیے" (ص ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے انکو کتنا کمانیکے قابل بنایا - اسی مادّی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹے کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹے ۲۰ منٹ دستکاری کے لیے وقف کیے گئے ہیں، اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائینگے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں - اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسکے پیش نظر ایک صنعتی سماج (INDUSTRIAL SOCIETY) پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادّی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادّی پیمانے ہی سے

زندگی کی ہر چیز کو ناپیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنیکا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پاسکے ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائیگی ۱؎

(۳) اس مادّہ پرست سوسائیٹی میں "شہریت" (CITIZENSHIP) کا جو مطمحِ نظر (IDEAL) اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"یہ ہونیوالی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن پر دن بڑھتا جائیگا" (ص ۱۳۱)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شائد عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائینگے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جسکو انہوں نے شدتِ یقین کی بنا پر پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھکر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے:

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے"۔

"اسکے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آئندہ اسکے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہوگا جسکی نیو مل کر کام کرنے اور محبت سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائیگی"۔

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے"۔

۱؎ کوئی شخص ہماری اس تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسبِ رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اسکی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارے اور وردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصدِ حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کیلئے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائیٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

"...... دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں"

"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیے" (ص ۱۸، ۱۱۱، ۱۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیشِ نظر مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یعنی ایک ہیئت اجتماعی یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اسلیے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ انکے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت انکے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانۂ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرون ہند کی تاریخ سے انکے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لیے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جس کا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دور رکھے جو ان کے فرق اور اختلاف کو نمایاں کرنیوالا ہو۔ اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اُتر جانے دیگی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائیگی۔ اسکے لیے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں، وغیر ذالک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرون ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے اور پراچین سمے کے ہندوستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر اور علی اور

بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کیلیے تیار ہونا چاہیے، اور کم از کم تذکیر کا فرض بجالانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے، اور انکے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے، اور ان کے قلب و روح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر علاج تجویز کرینگے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رو میں بہتے جارہے ہیں، اور نادانستہ انکی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے[1]۔ مولانا کے علم و فضل، انکی صداقت، ان کے تفکر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ سے تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور انکی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا انکی ذات گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے، بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحب فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے ــــ مولانا فرماتے ہیں۔

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہیں، اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو وہ اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کریں کہ اپنا

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت تو فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا جو "انصاری" کے رپورٹر نے روایت بالمعنی کے طور پر بیان کیا ہے۔

خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یونہی قائم رہنے دیگی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائیگی۔ اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے:

"ہم نے وردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے اسلیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جسطرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنیکے بجائے اختلاف پیدا کرنیکا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں[1]"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اُس پالیسی اور اُس مقصد ہی کے خلاف ہے جسکے لیے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہیے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے، ہم نے اُسی کو برقرار رکھا ہے، یعنی مدرسہ کے اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرلے[2]۔" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم اُنکے اس قول کی تکذیب کیلیے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اسکو یہ چیز بھی نقصان پہنچائیگی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصاب تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گروہ اوقات مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً اسے برداشت کرینگے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء

وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کر سکتے ہیں۔ انکے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیمی کی پالیسی یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا (ہندوستانیت کا نہیں بلکہ ہندوستانی قومیت کا) شعور پیدا کیا جائے۔ اگر انکے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ انکے نصاب میں کونسی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو، یا پیدا کرنا در کنار اسکو کم از کم باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر انکی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا ہے کہ وہ صریحاً دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں، اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے؟ اگر وہ شمال کیطرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ جنوب کیطرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں معاف فرمائیں، ہمیں انکے ذی عقل ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اور اگر وہ ارادہ یہی رکھتے ہیں کہ جنوب کیطرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے، مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عائد ہوتا ہے، اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

وردھا اسکیم کے انگریزی ایڈیشن میں تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے، افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعور اسلامی کو فنا کرنیکا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجہ والوں کو بودھ، عیسٰی اور محمدؐ کی اور چوتھے درجہ والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابرہام لنکن، ٹالسٹائے، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائینگی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کیساتھ موسٰیؑ، ابراہیمؑ اور مارکس اریلیس کے حالات

اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، ابودہ متی میں اور عیسٰی اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائینگے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اسکے خاص خاص مضامین یہ ہیں:

۱۔ محمدؐ، عمرؓ، علیؓ، حسینؓ، عمر ابن عبدالعزیز کے حالات۔

۲۔ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتدا۔ محمد بن قاسم۔ خواجہ معین الدین چشتی۔

۳۔ ہندی اسلامی تہذیب کے ارتقاء کی داستان۔

۴۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ اس کی توضیح امیر خسرو، کبیر، گرونانک، اکبر اور دارا شکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقاء:۔ غذا، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب و اطوار۔

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم ونسق؛ شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور "ہندوستانی" کا ارتقاء بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنون لطیفہ اور موسیقی۔ امیر خسرو، تان سین۔ ہندو مسلم فن تعمیر اور اسکے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی: البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، چاند بی بی، نورجہاں، اور چند صوفی بزرگ مثلاً دادو، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا۔ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت۔ ہارون الرشید کی علمی سرپرستی۔ صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمٰن الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کیساتھ۔

اس پورے نقشہ میں دیکھیے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا عام مشاہیر کی صف میں بیٹھے

ہیں - بلکہ کہیں کہیں انکو گوتوں کیساتھ بٹھایا گیا ہے۔ مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانینگے کہ وہ ان کے دین کے ستون ہیں بلکہ اس حیثیت سے جانینگے کہ دنیا کے دوسرے بڑے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں -

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح ان کے دماغ میں اتاری جائیگی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے۔ اس سے ان میں کبیر پنتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے، مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کیساتھ اگر ہمارے علما نے لڑ بھڑ کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سارا نظام تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اسکی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوئی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا - اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کیے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہو جائینگے۔

(۴) واحد قومیت، مادّہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری تھا، اسلئے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے۔ مذاہب اور انکی شریعتوں کو نو تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔ اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر "ہندوستانی قوم" کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی:-

> "ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے - اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کیلیے اہنسا کا طریقہ لیا ہے - ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے" (جامعہ صفحہ ۱۱۱)

> "جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان

کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہییں - انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہییں جن سے اہمسا اور اسکے ساتھ کی خوبیوں کا ہمسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو" (ص ۱۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کرکے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کر دی گئی - اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پاکر نکلے گی اس کے اخلاقی تصورات دین گاندھی پر مبنی ہونگے - ہندوستان کی زندگی کا راستہ ـــ اور مذہب کا کوئی مفہوم اسکے سوا نہیں کہ وہ زندگی کا راستہ ہی ہے ـــ یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھیگا اور اہمسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا -

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دی جائیگی اور اس عمر میں یہ بچے اس نظام تعلیمی کے سوا کسی دوسرے نظام تعلیم میں شامل نہ ہو سکینگے، اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطور خود بھی انکی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکینگے - حد سے حد پانچ فی صدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے - دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پاکر اٹھے گی اس پر مادّی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی - لہذا یقین رکھنا چاہیے کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان "ایک قوم" بن جائیگا -

انگریزوں نے کامل سیاسی اقتدار حاصل کرکے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی جو نہ آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنا سکی نہ پورے ہندوستانیوں کو آدھا انگریز مگر ہندوؤں نے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وہ اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شیخ سے بنوالی ہے جو انشاء اللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا "ہندوستانی" بنا کر چھوڑیگی - اسکے بعد کسے شک ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بہت بلند ہے، اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی

ہے کہ انہوں نے یہ شرف خود حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کیطرف منتقل کر دیا!

(۱۰)

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے مصنف صوبہ کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو مالوی جی کے خاص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو مالوی خاندان کا قائم کیا ہوا ہے۔ تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے۔[1] کانگریس پارٹی نے ۳۰ جولائی ۳۸ء کو انکی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جسکا مقصد دیہات میں عمومی لازمی تعلیم کیلیے ایک اسکیم وضع کرنا تھا۔ ۳۱ اگست کو یہ کام مکمل ہوا، ۵ نومبر کو حکومت سی پی کے تسلیم کردہ تعلیمی ادارات کی فیڈریشن نے اور ۱۴ نومبر کو محکمہ تعلیم کے افسروں کی مجلس نے، اور ۱۴ دسمبر کو سی پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اسے منظور کیا،[2] مگر مارچ ۳۹ء تک اس کی زیارت نہ اسلامی تعلیمی ادارات کو، نہ اسلامی اخبارات کو، نہ خود سی پی اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے یکایک مارچ کے اجلاس اسمبلی میں یہ اسکیم اس وقت آئی جب حکومت کے بجٹ میں اسکے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی امداد منظور کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اسمبلی کے ۱۴ مسلمان ممبروں میں سے ۱۳ نے سختی کیساتھ اسکی مخالفت کی۔ چودھویں مسلمان مسٹر شریف تھے جنہیں اس وقت وزارت کا شرف حاصل تھا۔ مگر انہوں نے بھی رکن حکومت ہونیکے باوجود رائے دینے سے احتراز کیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ۸ لاکھ مسلمانان صوبۂ متوسط کے باضابطہ نمائندے ہیں وہ اسے بالاتفاق نامنظور کر چکے ہیں اور اسکے بعد سے مسلمانوں کی تمام نمائندہ جماعتیں، حتی کہ

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۰ جون ۳۸ء

[2] "ودیا مندر اسکیم" شائع کردہ حکومت صوبہ متوسط۔ صفحہ ۱-۲۔ میرے پاس سی پی گورنمنٹ کی شائع کردہ اردو اور انگریزی دونوں اسکیمیں ہیں مگر میں اردو داں ناظرین کی سہولت کیلیے اردو ایڈیشن ہی کا حوالہ دونگا۔

صوبہ متوسط کی مسلم قوم پرست جماعت، اور اسلامی اخبارات نے بالاتفاق اسکی مخالفت کی ہے لیکن ۱۴ ستمبر ۳۸ء کو کانگریسی حکومت کی جانب سے جو پریس کمیونک شائع کیا گیا ہے اس میں "چند مسلمان افراد اور بعض مسلمان جماعتوں کی مخالفت" کہہ کر اس متحدہ قومی مخالفت کو ہلکا کرنیکی کوشش کی گئی ہے، بالکل اسی انداز میں، جس میں انکے انگریز اُستاد اب سے دو سال پہلے تک خود انکی چیخ پکار کو ہلکا قرار دیا کرتے تھے۔

اسکیم کو منظور کرنیکے بعد جو مجلس نصاب بنائی گئی اس میں سی پی کا ایک مسلمان بھی نہ لیا گیا بلکہ باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر اشرف کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ نئی سرکار کے منشا کے مطابق کام کرسکیں۔ مسلمانوں کے یہ "نمائندے" بھی صرف نصاب کے اصول مقرر کرنے کی حد تک مامور بکار رکھے گئے۔ اصل کام تو نصاب کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا یعنی کتب نصاب مقرر کرنا ہے جیسے ٹکسٹ بک کمیٹی کرتی ہے، اور اس کمیٹی میں برائے نام بھی کوئی مسلمان نہ رکھا گیا۔ یہ بالکل اس کمیٹی کے اختیار میں ہے کہ اصولوں کو جس شکل میں چاہے ڈھال دے، اور یہ اختیار بالکل ہندوؤں کا حصہ ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ سی پی کے محکوم مسلمان اپنی آئندہ نسل کی تعلیم کے معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے۔ انکے نئے حکمراں جو کچھ انکے حق میں فیصلہ کردیں اسکے آگے انہیں سر جھکا دینا چاہیے۔ یہ ہے اُس "سوراج" کی حقیقی تصویر جس کے لیے کانگریس جدوجہد کر رہی ہے اور اس تصویر کو قبولیت کا شرف جناب مولانا ابوالکلام نے عطا فرمایا ہے کہ ۲۵ جون ۳۸ء کو آپ بنفس نفیس وِدیا مندر ٹریننگ اسکول (وردھا) میں تشریف لے گئے اور "قومی تہذیب" کو ترقی دینے والے اس ادارہ کی مدحت سرائی فرمائی[1]۔

یہ اسکیم خالصتہً دیہی علاقوں کیلیے بنائی گئی ہے[2]، یعنی اسکا اثر سی پی کے ان لاکھوں مسلمانوں پر

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۷ جون ۳۸ء۔ "قومی تہذیب" کا لفظ خود حضرت والا ہی کی زبانی اس اخبار نے نقل کیا ہے۔

[2] سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

پڑیگا جو ۳۹،۶۲ قریوں میں بکھرے ہوئے اور ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت میں گویا آٹے میں نمک کی حیثیت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ نئی کانگریسی حکومت، انکی تعلیم کا انتظام کرنے کا ذمہ نہیں لینا چاہتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت کیساتھ مل کر اس تعلیمی انتظام کو قبول کریں جو مجموعی طور پر کیا جائے[1]۔ اسی غرض کیلیے یہ اسکیم بنائی گئی ہے۔ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کئے جائینگے انکا نام "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے۔ لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے۔ ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادتگاہ ہی کے سمجھتا ہے۔ مگر سی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی، دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابل اعتراض نہیں ہے[2]۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابل اعتراض ہونی چاہیے اور کیا نہ ہونی چاہیے، خود مسلمانوں کے بجائے انکے نئے حکمرانوں کے کرنیکا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں انکا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں[3]۔ مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جاسکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کیلیے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے[4]۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ انکی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہوسکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کرسکتے وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہوگا اسکا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔

(۲) اسکیم سردست اختیاری ہے، مگر آگے چل کر اسکو جبری بنادیا جائیگا، یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعہ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہوگا۔

---

[1] "ودیا مندر اسکیم" صفحہ ۲

[2] ہریجن مورخہ ۱۵ اکتوبر ۳۸ء - اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

[3] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر۔

[4] ودیا مندر اسکیم۔ صفحہ ۶-۸

وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائیگا کہ دوسو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں۔ اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کیطرف منتقل ہوگی[۱]۔ اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:

"چھوٹے بڑے مٹھوں اور دیگر مذہبی اور خیراتی اداروں، مندروں، مسجدوں وغیرہ کے مالکوں اور متولیوں کو احساس ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں اور اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کرنیکا فخر حاصل کریں (اسکیم۔ صفحہ ۱۵)

اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری و لازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیے جائینگے۔

(۳) ہر مدرسہ کیلیے ایک کمیٹی بنائی جائیگی جسکے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا۔ اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک متصور ہوگی[۲]۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بے دخل اور ملکیت سے بھی بیدخل۔ ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کردینا ہے۔

(۴) مدرسہ میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کریگا جسے ۵ سال کیلیے امتحاناً مقرر کیا جائیگا، پھر ہر سال کیلیے مستقل کردیا جائیگا۔ اگر کمیٹی کی رائیں اسکا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکال دیگی۔ اسکے فرائض یہ ہونگے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور گاؤں کے تمام معاملات کو "قومی رنگ" (National Out Look) میں رنگنے کی کوشش کرے[۳]۔ قومی رنگ کا مطلب صاف ہے۔ بچوں میں اور اپنے

---

[۱] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶-۸-۹-۱۵

[۲] ایضاً صفحہ ۱۰ و ۱۱

[۳] ایضاً صفحہ ۱۳ و ۱۴

زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملّی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائیگا۔ مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آ گیا تو کمیٹی یہ کہہ کر باسانی اسے نکال دیگی کہ یہ "قومی رنگ" نہیں دیتا یا مقررہ نصاب کے خلاف بھی کچھ دینی کلمہ و نماز وغیرہ سکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات برس تک مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو (اس لیے کہ تعلیم مخلوط[۱] ہوگی) کلیتہً ایک ہندو استاد کے زیر اثر اور کثیر التعداد ہندو بچوں میں گھرا ہوا رہنا پڑے گا جہاں "قومی رنگ" ہر طرف سے ان کو محیط ہوگا اور خدا اور رسول کا نام تک ان کے کانوں میں نہ پڑے گا کجا کہ اسلامی زندگی کا کوئی نشان وہ دیکھ سکیں۔

وہ اغراض و مقاصد میں تصریح کی گئی ہے کہ گاؤں کے بچوں میں "قومی نقطۂ نظر" پیدا کیا جائیگا۔ "ودیا مندر ایک اہم سوشل مرکز کا کام دیگا جہاں استاد بچوں کے والدین، لڑکے لڑکیاں سب جمع ہوکر ان مسائل کو جن سے انکو سابقہ پڑتا ہے بحث مباحثہ کرکے حل کرنے کی کوشش کرینگے خواہ وہ مسائل "قومی" ہوں، سوشل ہوں یا تعلیمی"[۲]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ودیا مندروں کے ذریعہ سے دیہات کی منتشر و پراگندہ مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم کوشش کی جائے گی اور تربیت یافتہ مہاشے تمام دیہی علاقوں میں پھیلا دیے جائیں گے تاکہ وہ گاؤں کی پوری زندگی کو اپنے گرد مرتکز کرلیں اور نہ صرف تعلیم کے ذریعہ سے بلکہ سوشل اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ سے بھی سب کو ایک اجتماعی وحدت بنا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ دیہات کی مسلمان آبادی خود بخود ناپید ہو جائے گی اور چند سال بعد جو مسلمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھینگے تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہروں

[۱] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۸

[۲] " " "

کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتی ہے اور مال غنیمت پر قبضہ کرتی ہے اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مال غنیمت میں جھگڑا کریں۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہوکر آزادی کیلیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہوکر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں (" الضاری" مورخہ ۳ رمضان ۱۳۵۶ھ)۔

غور کیجیے! یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے: "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اسکی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے۔ اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی، جو ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں، شیروں کی طرح شکار مار لینگے تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آکر حصہ لڑانے کی کوشش کرے گی"۔ — یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے۔ اور اسکے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیران بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کیلیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پھر یہ "جنگ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں، ایسی پاک جنگ، ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا، اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینہ ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ جنکے علم، تقویٰ اور دیانت کا احترام میرے دل میں انکے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

میں رہ گئے ہیں، اصلی ہندوستان یعنی دیہی ہندوستان میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

(۶) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو گی اور مادری زبان کی تفسیر حکومت کے کمیونک میں یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد علاقہ کی زبان ہے[1]۔ یعنی وہ زبان نہیں جو بچہ کی ماں بولتی ہے بلکہ وہ زبان جو علاقہ کی ماں بولتی ہے۔ اب صوبۂ متوسط میں تلاش کیجیے کہ کونسا علاقہ ہے جس کی ماں اردو بولتی ہو۔ وہاں کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کی مائیں تو سب کی سب خالص اردو بولنے والی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی علاقے دو ہی قسم کے ہیں، یا مرہٹی بولنے اور لکھنے والے، یا ہندی (ناگری رسم الخط کے ساتھ) لکھنے اور بولنے والے۔ لہٰذا مادری زبان کی تفسیر علاقہ کی زبان سے کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اردو خود بخود خارج از بحث ہو گئی۔ مسلمان اگر چاہیں تو اردو مدرسہ قائم کر سکتے ہیں، مگر صرف اس جگہ جہاں وہ چالیس بچے اردو پڑھنے والے فراہم کریں اور دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد دے سکیں۔ جہاں اقلیت یا غربت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکیں گے (اور شائد سی پی میں بہت ہی کم مقامات پر وہ ایسا کر سکیں گے) وہاں ان کے بچوں کو مرہٹی یا ہندی میں ہی سب کچھ پڑھنا ہوگا۔ اس کے بعد "متحدہ قومیت" آپ سے آپ پیدا ہو گی۔

(۷) حکومت کی پوری طاقت اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں صرف ہو گی۔ ابتداءً ہر تعلقہ اور تحصیل میں حکومت اپنے خرچ سے چند ودیا مندر قائم کرے گی۔ مدرسوں کی تنخواہیں حکومت کے خزانہ سے ملیں گی۔ ودیا مندر تعمیر کرنے کے لیے

[1] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۳۸ء۔

ضروری سامان بھی حکومت دے گی[1]۔ تمام سرکاری محکمے ودیامندر کی پشت پر مدد کے لیے حاضر رہیں گے۔ محکمۂ زراعت، محکمۂ طبابت وحفظانِ صحت، محکمہ امداد باہمی، محکمۂ علاج حیوانات، محکمۂ تعلیم، غرض سب اپنے اپنے دائرہ میں ودیا... مندروں کو مادّی، علمی و فنی اور اخلاقی و نفسیاتی امداد دینگے۔ یہ معنی ہیں قومی جمہوری حکومت کے۔ ۸ لاکھ مسلمان اس جمہوریت کا ایک جز ہیں تو ہوا کریں۔ دولت مشترکہ کی پیدائش میں ان کا حصہ ہے تو ہوا کرے۔ مگر ہیں تو وہ اقلیت میں۔ لہذا جس دولت اور طاقت فراہم کرنے میں ان کا حصہ ہے اس کا مصرف متعین کرنے میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کو اکثریت اپنے منشا کے مطابق استعمال کرے گی اور ایسے کاموں میں استعمال کرے گی جو ان بے زور حصہ داروں کی ہستی ہی کو ختم کر دیں۔

(۸) سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدودِ عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اسلیے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کر رہی ہیں اور ان کی جگہ ودیامندر قائم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو نہیں روک سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھینگے کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیامندر قائم کرنے میں صرف ہو گی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائے گا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائے گا اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ حال میں ضلع امراؤتی کی وَرود میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیامندر بنا دیا، مسلمانوں نے احتجاج

[1] ودیامندر اسکیم صفحہ ۱۱

کیا، مگر پرِکاہ کے برابر بھی اسکی وقعت نہ کی گئی[۱]۔ سچ فرمایا پنڈت جواہر لال نہرو نے۔ جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے!

(۹) وردھا میں ودیا مندروں کیلیے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۶۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اور حکومت صوبۂ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جاکر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں[۲]۔ مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اس صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اردو کی محض شُد بُد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں۔ جن بیچاروں کا املا اور تلفظ تک درست نہیں، جو اردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ ہمارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دینے جائینگے[۳]۔

سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے۔ تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ محض اردو رسم الخط سکھانے کیلیے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے۔ مسلمان طلبہ اچھوتوں کیطرح رہتے ہیں، الگ کھاتے ہیں، پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے

---

[۱] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۹۱ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۳۸ء

[۲] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۳۸ء

[۳] مدینہ مورخہ ۲۸ جولائی ۳۸ء

اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے (یا اگر مجبور نہیں تو تربیت سے ایسا بنایا جاتا ہے) کہ پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں[1] - یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشو و نما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہار مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی "برکتوں" کے ساتھ ہوا ہے![2]

---

[1] مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء

[2] وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں اُن کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہوں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کر سکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام دنیوی تعلیم ہی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اور تعلیم کو عام کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانے پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن عام ناظرین کی معلومات کے لئے میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے فرانس، چیکوسلواکیا، روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جا رہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا انتظام ایک ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستور سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اُس کے بچے کو اُس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اوقات مدرسین اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدہ کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور وہ مطالبہ کریں کہ اُن کے لئے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام اُن کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۱)

ان تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "جنگ آزادی" کے نام سے برطانوی حکومت کے زیر سایہ بتدریج سیاسی طاقت حاصل کرنے کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ کس طرح مسلمانوں کی قومیت اور اُن کی قومی طاقت کو فنا کرنے کے لئے استعمال کیجا رہی ہے، اور کس طرح ہمارے ہمسایہ رفیق قومی امپیریلزم کے وہ تمام ہتھکنڈے اختیار کرتے جارہے ہیں جنکو انہوں نے اپنے انگریز استادوں سے سیکھا ہے۔ لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائیگا اگر اسی سلسلہ میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے جو زبان کے باب میں کی جارہی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کرے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمۂ تعلیم صرف اُن کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت مالی امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلیویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اسکا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم چاہتے ہیں نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود بنانے کا بھی حق ہے اور حکومت کے خزانہ سے اُن کی اعانت کیجاتی ہے۔ لتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کے لئے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے۔ اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں جن کے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہاں بھی مذہبی تنظیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنے کا حق ہے اور حکومت انکو اس شرط کیساتھ امداد دیتی ہے کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائے گا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے، اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروؤں کے لئے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ ایستھونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس (بقیہ اگلے صفحہ)

ایک قوم کی زبان اور اُس کا رسم الخط اُس کی تہذیب اور اُس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کُن اہمیت رکھتا ہے کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اُس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اُس کی آنیوالی

(بقیہ حاشیہ) میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لئے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

THE NEW DEMORATIC CONSTITUTIONS OF EAULROPE.

BY AGNES HEEDLAM - MORLEY, P 53 - 57

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذاہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لئے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمام تر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے والدین استثناء کا مطالبہ نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر صرف اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے پیروؤں کی تعداد مدرسہ میں زیادہ ہو۔ لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو ان کے لئے علیحدہ انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا چودھواں اڈیشن مضمون ایجوکیشن)

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساسِ خودی کو مٹانے کے لئے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لیکر اٹھینگی۔ جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے اُن سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں، اور اُس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو خود اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنے والی اور اپنے رسوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو RUSSIFICATION یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اُن کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اُس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو اُن کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا، اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی تک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گزری ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش

یہ ہے کہ "یہاں ایک متحد قوم پیدا ہو" اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہونگی تو الگ قومیں بھی رہینگی۔ الگ قوموں کو فنا کرکے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت، تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑیگی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لئے ہیں اور کچھ کرنے کے لئے۔ دکھانے کے لئے تو یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اردو اور ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط مسلّم ہیں اور دونوں کو نشوونما کا پورا موقع ملنا چاہئے۔ لیکن فی الواقع کیا کیا جا رہا ہے؟ اس کے لئے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:-

(۱) فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے، یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

مشہور	بجائے	پرسدھ	تعلیم	بجائے	شکشا	وقت	بجائے	سمے
شہر	،،	نگر	صوبہ متحدہ	،،	جنٹ پرانت	آدمی	،،	نش یا پرش
ضروری	،،	اوشک	مقدمہ	،،	ٹنٹا	شیر	،،	سنگھ
آزادی	،،	سوتنترتا	صدر	،،	سبھاپتی	بندر	،،	وانر
صوبہ	،،	پرانت	ہندوستان	،،	بھارت ورش	دوستی	،،	مترتا
صوبہ متوسط	،،	پرانت کوشل	حاکم	،،	اتھم	ترقی	،،	انتی

۵۱؎ "جامعہ" اکتوبر ۳۶ء

پوتھی	بجائے	مسل	مت بھید	بجائے	اختلاف	لاگو	بجائے	نافذ
جھگڑا ابیلھڑو	"	مدعی	پرستاؤ	"	تجویز	ودربھا	"	برار
سدھانت	"	اصول	سنشودھن	"	ترمیم	اگوا	"	لیڈر یا رہنما
گھوشن	"	اعلان	گرہن	"	منظور	جھگڑا ودجے	"	مدعا علیہ

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس ملک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان و ادب میں سے ہمارے حصہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اُس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

(۲) متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:۔

"اس سبھا کا پتی تو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی ترنت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کرینگے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائینگے یدی ہم شری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرو گڈھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔

تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اپنا دی
آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی ہتھا
یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں[1]"۔

آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم صوبۂ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یو۔پی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے :-

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبتا ہے کہ
شکشت شمیا کے پرت لوگوں کا اگر شٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہوگیا
ہے۔ یہ بات ادھکانش بسیئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سا ہم
اپنے دیش میں بھی اس لشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے
ہیں اور ان کا انبھو کر رہے ہیں۔ آجکل ہم اپنے کو جس مانسک اور پدمعارتک
پرستھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک
اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو
سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشلو دیاپی پرگت کو ہمارے سمکھ
نش سندیہ ایک لشیس روپ میں اپشتھت کیا ہے اور ایک وشیس
بھارتیہ سمسیہ بنا دیا ہے[2]"

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگریس کمیٹی کے خیر مقدم میں پیلی بھیت کی کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے :-

"ہمارے صوبہ کے پرسد نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم۔ایل۔اے

---

[1] جامعہ بمبئی ۱۹۳۶ء۔ [2] مدینہ ۱۳ ستمبر ۳۸ء

"جس طرح آزادی کیلیے جدو جہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے، اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے، بلکہ ان کیلیے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چند در چند زائد ہیں۔ پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے" (مولانا حسین احمد صاحب کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵ اپریل ۳۸ء)

یہاں بھی وہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جدوجہد فی الواقع خالص آزادئ وطن کی جدوجہد ہے اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جدوجہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس سے ان کا علحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ "انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے"۔

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالامال ہیں، اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کیلیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۵۷ء کے بعد سے شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۸۵ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمراں ایسا نہیں آیا جس نے اکثریت کی جیرہ دستیوں سے بچاؤ کیلیے مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلمہ پالیسی نہ قرار دی ہو۔ اور یہ تنظیم اس تھوڑے سے وقفہ کے سوا جو تحریکِ خلافت

(سینٹرل) جو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں، ۲۷ مئی ۱۹۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں۔ جنتا کو چاہیئے کہ اس سنہرے اوسر سے لابھ اٹھانے کے لئے یوب ولیش کے پرت اپنے سچے کرتوکو جاننے کے لئے ۲۶ تاریخ کی شام کو اعکاد معک سنگھیا میں راشٹرسا کاؤں کیساتھ میں آجانا چاہیئے اور ۲۷ مئی ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے اُن کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھایئے۔

پروگرام ۲۷ مئی کا

پرت کال	۷ بجے سے ۹ بجے تک	جلوس
"	۹ بجے سے ۱۰ بجے تک	جل پان
مدھنان	" " ۲ بجے تک	بھوجن وشرام
	۲ " ۵ "	" کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک

نویدک

دستخط اوپ منتری دستخط پریزیڈنٹ

شہر منڈل کانگریس کمیٹی۔ پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے:۔

"آگرے میں سماج وادی مہاغنطر۔ لگاتار چھ دن تک۔ اکھل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا"

"ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ اکتوبر سے برابر

چھ دن تک اکھل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے ایک وشوں پر اپنے سناگر بہت اور ودتا پورنڑ بھاشنڑ دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لئے یہ اپور وادسر ہے کی دسے دیش کے درگج سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج واد کو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہئے۔ بھاشنڑوں کے وشے کمیونزم، سوشلزم، پونجی واد، ورک بندہ، سامراجیہ واد، فیسزم، نرم وگرم دل فیڈریشن، کسان کرانتی، وشو شانتی کی سمسیا۔ ودیارتھی اندولن۔ کسان مزدور اندولن۔ روس کی کرانتی سماج وادی روس۔ انتر راشٹریہ۔ شر سبتھمت آدی۔ آدی۔ بھاشنڑ میں پرویش چار آنہ کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر پڑھکہ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا، تتھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے ان کے نام اس پرکار ہیں:۔

"ڈاکٹر اشرف کے ایم آبھا گا کانگریس کمیٹی کے راج نیتک وبھاگ کے پردھان۔ آچاریہ نریندر دیوا اکھل بھارتیہ کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے پڑھکہ سدسے تتھا کانگرس کارشمتی کے بھوت پورو سدسے۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اکھل بھارتیہ کانگرسی سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے سدسے تتھا آبھا کانگرس کمیٹی کے آرتھک دبھاگ کے بھوت پورو۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ اکھل بھارتیہ کانگرس کمیٹی کے ویدیشک وبھاگ کے منتری تتھا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کے کارکارنی کے سدسے۔ کا سجاد ظہیر بارایٹ لا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کی سدسے۔ کاہرش دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کارکارنی کے پرکھہ سدسے۔

"دھیان رہے یہ بھاشنڑ ۱۱ اکتوبر سے شام کو ۸ بجے سے ۹ بجے تک ہونگے۔"

استھان کی سوچنا شکر دی جائے گی۔ یہ بھاشنز شہر کانگرس کمیٹی کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنیکت پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہا دیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگرس سوشلسٹ پارٹی آگرہ

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار "قومی مجلسوں" سے لیکر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک ہر آلۂ نشر واشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جارہی ہے اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو کیسی "ہندوستانی" زبان بنائینگے۔

(۳) اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جسقدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اس اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبۂ بہار میں ۳۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کہ اُن کے لئے تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۵۷ فیصدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فی صدی۔ بھاگلپور ڈویژن میں ۷۱ فیصدی اور ترہٹ ڈویژن میں ۵۵ فیصدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں اُن کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے، یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فیصدی حصہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملیگی کہ "مذہبی" کے

معنی "رام اوتار" کے ہیں[1]۔ ایک چانول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں نے دیکھا کہ اردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے، اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ہندویت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شری مان" کہیگا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبۂ متوسط کی ہے۔ ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازماً ہندی رکھی گئی ہے اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۱۰۷ ہندی اسکول قائم کئے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا[2]۔ یہ صرف ابتدا ہے۔ ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائیگا۔ ابتدائی تعلیم تمام تر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۱۵ سو انتخابی حلقوں سے

---

[1] عبدالغنی صاحب ایم ایل اے (سنٹرل) کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا یکم مارچ ۱۹۳۸ء

[2] "مستواد" مورخہ ۲ر فروری ۱۹۳۸ء۔ خود سی پی کے وزیر اعظم نے بھی اپنے سرکاری کمیونک میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اردو اسکول بند کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۸ر جون ۱۹۳۸ء

نصف ورجن مسلمان بھی منتخب نہ ہوسکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانے سے کہیں اردو ودیا مندر یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائیگا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعوے کو جھوٹا اور منافقانہ دعویٰ ثابت کر رہے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے۔ سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۸ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبدالرحمان خاں صاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات "اردو زبان" میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے انہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجے۔[1] اسمبلی کی کارروائی قلمبند کرنے کے لئے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا ہے مگر اردو رپورٹر رکھنے اور اُردو میں کارروائی شائع کرنے کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیکر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کارروائی اُردو اور ہندی دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ:۔

> "جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے انہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دیکر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہوسکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ کیا

---

[1] عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابل عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔

مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اُردو میں تقریر کرلیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اُردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں بھی رائج نہیں، اسمبلی میں بھی اُسے رائج نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے"۔[1]

(۴) عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی"۔ جو یوگوسلویا کی "سرب لوکرو ٹوسلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرمادیا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانیوالی ہے۔[2] اب مقابلہ رہ جاتا ہے اُردو اور ہندی میں، تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے۔[3] ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنالال بجاز کے زیر صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اُس کو پیغام بھیجتا ہے کہ :-

---

[1] مدینہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء۔

[2] HINDUSTANI OF THE CONGRESS CONCEPTION HAS YET TO BE CRYSTALLISED INTO SHAPE (HARIJAN, 29 Oct. 1938)

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۰ جولائی ۱۹۳۸ء۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور ہندی یا ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی اُنہیں سیکھنی چاہئے کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی"[1]

یو۔پی کا وزیر تعلیم ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے :-

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔"

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں میں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔

(مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان مٹانے اور دوسری قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

یہ ساری روداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

قیدخانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر جیلر سے لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے کار خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا۔ لیکن یہاں صورتِ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے۔ وہ مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنا دیں، جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہوگا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھونگا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اُسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں اُن سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق و سلاسل اُتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے۔ اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر یہ ہمارے رفیق زنداں صاحب جو اب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا چسکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزوِ بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں۔ اب اگر میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کرونگا تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان فرما سکیں۔ اور اگر میری جیسے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھری میں بے فکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے لپست ہمت اور ذلیل بنا دیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤنگا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرونگا کہ حضور کا دم سلامت رہے، جبتک آپ جیتے ہیں اُس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہوگا، اُسوقت

دیکھی جائے گی، جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہوگی بھگت لینگے لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اُٹھونگا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤنگا، تو بہت اچھا، مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہئے۔ قیدی کی زندگی سے، اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑ کر مارا جاؤں۔ اس مردانہ کام میں دو رہی کا ہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکّار رفیقِ زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بنکر رہو۔

نوٹ:۔ یہ پرچہ کی کتابت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ۱۹ ر نومبر کے زمزم میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان نظر سے گزرا جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے، اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو اُنہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی۔ اور اُس نے اُن کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرماتے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ درحقیقت قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ خود اُنکے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت نوسمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جا کر سردار پٹیل کی خدمت یا کسی اور سرکار کی خدمت میں عرض معروض کر دے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اُس وقت ہو سکے جبکہ

وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحتِ وقت تلافی کرنا چاہیں۔ یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو ابتک انگریزی سلطنت میں ہمیں حاصل ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کرسکتا بلکہ جاکر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے، اور وہ اگر مہربان ہوں یا مصلحتہً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہوجاتا ہے، ورنہ اکزیکیٹو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر یہ منصب کام آجائے ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے۔ مان لیا کہ کانگریسی حکومتوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور غایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہورہی ہے اور یہ بھی تسلیم کرلیا کہ جتنی شکایات ابتک اُردو اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ دستور کی نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری ارتقا کیلئے ہورہی ہے۔ اگر اس کی نوعیّت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لئے ہم پر حاکم ہوں کہ اُنکے سر ہم سے زیادہ ہیں، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے۔ آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لئے سُن لی جاتی ہے کہ اُن سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سنی جائیگی اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہوگی کہ جب اُسکی نہ سنی جائے تو وہ کچھ کرسکے۔ ہمارا اصلی جھگڑا اسی باطل اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس تمام شکایات بیتول کے مدرسے اور ودیا مندر کے نام و ایسی ہی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے۔ جو لوگ مولانا کے علم اور اُن کی دانائی کے معترف ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانشمندی و بصیرت کی توقع اُن سے رکھتے تھے +

سے نے پیدا کر دیا تھا پورے استحکام کیساتھ باقی رہی ہے اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اسکی رضاعت اور تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں، اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے اُن پر عائد ہوتا ہے، بے پروا ہو جائینگے۔ پس جو چیز بنی بنائی موجود، اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چونے گارے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپکے اس حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدار آپ کیوں اس درجہ مضطرب و سراسیمہ ہوں۔ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کر کے محض فرضی خطروں کا سدباب کرتی رہتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور بے خرد ہوگئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقار کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی اعدار کے حملوں کا ہدف بننے کیلیے چھوڑ دے گی"۔ (الاصلاح۔ سرائے میر۔ مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:۔

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اللہ سے ڈرائیے"۔

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی یہی آزادی کی جنگ!) ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتمندی تمہارے ہی لیے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے

تنبیہ الغافلین

گذشتہ صفحات میں نیشنلزم اور آزادئ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اُس کی موت ہماری زندگی ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کلّی اختلاف ہے، ایسا شدید اختلاف کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے۔ ہمارا اور اُس کا تبایُن اس نوعیت کا ہے جیسا مشرق اور مغرب کا تبایُن ہے کہ جو شخص مشرق کی طرف جانا چاہتا ہو اُس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے مُنہ موڑ لے۔

اب جو شخص اس تحریک کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے وہ لامحالہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہے۔ یا تو وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے منطقی اور واقعی نتائج کا پورا شعور رکھتا ہے اور اس شعور کے ساتھ اُس نے اپنے لئے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔ یا پھر وہ کسی غلطی کا شکار ہے۔

پہلے شخص سے ہمارا کوئی جھگڑا اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمیں اُس کی منافقت پسند نہیں ہم اُس سے صاف کہتے ہیں کہ جب تم اسلامی قومیت کی نفی کرنے کے لئے بالارادہ تیار ہو اور اُس جمہوری نظام میں صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہو جس کو

واحد وطنی قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا جارہا ہے تو تمہیں آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے آپکو نام چارے کے لئے اسلامی جماعت سے بھی وابستہ رکھو؟ یہ نہ صرف منافقانہ حرکت ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا سراسر نقصان ہے۔ اقلیت کا ٹھپہ جبتک تمہارے اوپر لگا رہے گا اُس وقت تک اکثریت کی حکومت میں تمہارے ساتھ امتیازی برتاؤ بہرحال ہوگا خواہ تم ایک سو ایک فیصدی نیشنلسٹ بن جاؤ۔ تمہارا نام ہر جگہ تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ ہر ذمہ داری کا منصب تمہیں دیتے ہوئے اکثریت جھجکے گی۔ صدارت کی کرسی، وزارتِ عظمیٰ، پارٹی لیڈرشپ، مالی اعانت، غرض ہر اہم چیز تم کو دینے میں فطری طور پر بخل سے کام لیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اگر تم ایثار کے لئے تیار ہو تب بھی یہ تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک علیحدگی پسند قوم سے ظاہری وابستگی برقرار رکھ کر تم اپنے مقصد — واحد قومیت کی تعمیر — کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ جبکہ ایک قوم اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو تمہارے اوپر یہ فرض عائد ہوجاتا ہے کہ اُس سے علیحدگی اختیار کرو بشرطیکہ تم اپنے مقصد کے سچے وفادار رہو۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اپنی قومیت کی نفی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ دل سے اس کے بقا اور نشو و نما کا آرزو مند ہے، اور اس امر کی حقیقی خواہش رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اُس کی قومیت کو آزادی، خود اختیاری اور ترقی کا پورا موقع ملے، مگر اس کے باوجود کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہوگیا ہے جو اُس کے قومی نصب العین سے اصولی، مقصدی، اور فعلی مخالفت رکھتی ہے۔ ایسے شخص کی حالت کا ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا ہوگا کہ وہ کس نوعیت کی غلطی یا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے مرض کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت سے واقف

نہ ہو، بلکہ چند سطحی باتیں اپنے حسب منشا پاکر اس کے ساتھ لگ گیا ہو۔ گذشتہ صفحات اس بیماری کا علاج کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آنکھیں کھول کر انہیں پڑھے گا تو انشاء اللہ شفایاب ہو جائے گا۔

دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے نتائج کو سمجھتا ہو، مگر علم و واقفیت کی کمی نے اُسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو کہ ہندوستان میں آزاد حکومت کا نشو و نما اُن جمہوری اصولوں کے سوا کسی دوسری صورت سے ممکن ہی نہیں ہے جن کو یہاں رواج دیا جا رہا ہے، لہٰذا وطنی آزادی کی خواہش رکھنے والے کو چار و ناچار انہیں قبول کرنا ہی پڑیگا۔ ورنہ پھر دوسرا راستہ اور ایک ہی راستہ انگریز کی غلامی ہے۔ جو لوگ اس غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں انہیں اس کتاب کا آخری باب کھلے دل سے پڑھنا چاہئے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُن کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علمی و نظری حیثیت سے تو ایک شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے۔ مگر یاس، بزدلی اور کم ہمتی نے اس کے دل پر قابو پا لیا ہے۔ اسے یہ تو خبر ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری صحیح تر صورتیں بھی موجود ہیں۔ مگر وہ ایک طرف اپنی قوم کی بے چارگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ وطنی قومیت اور جمہوریت کی پشت پر زبردست طاقتیں ہیں جن کا مقابلہ یا تو کیا ہی نہیں جا سکتا، یا اگر کیا جا سکتا ہے تو اپنے آپ کو بربادی و ہلاکت کے خطرے میں ڈالنا پڑیگا اور پھر بھی کامیابی کی اُمید کم ہی ہے۔ ایسے شخص کے لئے ہم خدا سے دعا کریں گے کہ اس کے دل میں ایمان کی طاقت پیدا ہو۔ اور اس شخص کو بھی مشورہ دیں گے کہ بندہ خدا، اگر تجھ میں تائید حق کا بل بوتا نہیں ہے تو باطل کی تائید کر کے اپنی قبر میں آگ کیوں بھرتا ہے۔

جا، اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر۔ یہ فتنہ کا وقت ہے۔ جو مردِ میدان بن کر نہیں نکل سکتا اُس کے لئے سلامتی ایمان کی راہ صرف یہی ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ جائے۔

چوتھا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی پر جذبۂ انتقام مستولی ہوگیا ہو۔ اسے انگریز کے ہاتھوں سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہوں کہ وہ جوشِ غضب میں اندھا ہوگیا ہو اور کہتا ہو کہ اگر حق کی تلوار نہیں ملتی تو پروا نہیں، میں باطل ہی کی تلوار سے اس دشمن کا سر اُڑاؤنگا۔ چاہے ساتھ ہی ساتھ میری اپنی ملت کی بھی رگِ جان کٹ کے رہ جائے۔ ایسے شخص کی بیماریٔ دل کا علاج خداوند عالم کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ اللہ اُس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبہ کے ساتھ چل رہا ہے اسمیں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کردے گا اور قیامت کے روز اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اُس کے نامۂ اعمال سے غائب ہونگی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی وارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمۂ عظیم اس کی گردن پر ہوگا یحملون اوزارھم واوزار الذین یضلونھم۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ ایک شخص اس فعل کو کارِ ثواب سمجھ کر کر رہا ہو۔ وہ اس خیال میں مبتلا ہو کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہوجائے تو پروا نہیں۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان تو اس بلا سے نجات پاجائیں گے۔ اس خیالِ خام نے جس شخص پر قابو پالیا ہے اُس سے ہم تین باتیں عرض کریں گے:۔

(۱) انگریزی امپیریلزم کو اگر کوئی چیز ختم کرسکتی ہے تو وہ آزادیٔ کامل کی خالص انقلابی تحریک ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ بلا دور ہوگی نہ آپ کا مقصد حاصل ہوگا۔ لیکن یہ تحریک جبکا

ساتھ آپ دے رہے ہیں، نہ آزادی کامل کی تحریک ہے، اور نہ خالص انقلابی تحریک۔ اسکی جو حقیقت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اُس کی تردید میں اگر آپ کے پاس کانگریسی لیڈروں کے بعض زبانی دعووں کے سوا کوئی ثبوت ہو تو بسم اللہ، اسے سامنے لے آئیے۔ ورنہ صریح واقعات کے خلاف آپ کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ اس تحریک کی حمایت سے آپ دنیائے اسلام کو آزاد کرالیں گے محض بے معنی ہے۔ اور بلادت ذہن کے سوا کسی دوسری چیز پر دلالت نہیں کرتا۔

(۲) پھر اگر بالفرض اس وطنی قومیت کی تحریک سے آپ کو فی الواقع دنیائے اسلام کی آزادی حاصل بھی ہوسکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ اس پاک مقصد کے لئے یہ ناپاک ذریعہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کی مسلمان قوم کا ارتداد دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہوجائے اور اُس کی آئندہ نسل سے مادہ پرست دہرئیے پیدا ہوں، جن کے عقائد، اخلاق اور اعمال میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کیا اس نتیجہ کو سامنے رکھ کر کوئی شخص جو علم دین سے ذرہ برابر بھی بہرہ رکھتا ہو، یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ دنیائے اسلام کی آزادی کے لئے یہ قربانی دینا بھی جائز ہے؟ اگر محض جان اور مال کی قربانی کا سوال ہوتا تو پروا نہ تھی ہم کھلے دل کے ساتھ کہتے کہ اس سرزمین کا ایک ایک مسلمان اس مقصد کے لئے کٹ مرے حتّٰی کہ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ لیکن یہاں سوال دین و اخلاق کی قربانی کا ہے۔ یہاں یہ قربانی دینی پڑتی ہے کہ ہماری نسلیں باقی رہیں مگر مسلمان نہ رہیں۔ تو یہ قربانی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی اور مقدس سے مقدس چیز حتّٰی کہ بیت اللہ اور گنبدِ خضراء کے لئے بھی نہیں دی جاسکتی۔

(۳) وطن پرستی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہوجائے تو دنیائے اسلام کے لئے انگریزی

امپیریلزم کے بجائے ہندوستانی امپیریلزم کا خطرہ پیدا کردیگی نیشنلزم تاریخ کے دوران میں اکثر امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ نیشنلزم کا نشہ جب کامیابی سے ہمکنار ہوگا تو امپیریلزم کا جنون بن جائے گا اور اس وقت دنیائے اسلام کے قلب میں ایک دوسرا جاپان پیدا ہوگا۔ آپ کی موجودہ نسل نے تو محض پیٹ کی خاطر ارضِ عرب میں دادِ مردانگی دی ہے لیکن آپ کی آئندہ نسل جو وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم سے تیار ہوگی وہ اعتقاد کی قوت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیگی۔ اس کا ضمیر اس فعل پر ملامت نہ کریگا بلکہ اُلٹا فخر کرے گا کہ اس نے ہندوستان کا نام اونچا کیا اور اپنی "قوم" کے آگے دور و نزدیک کی قوموں کے سر جھکا دیئے۔ پس درحقیقت ہندوستان کے مسلمان پر نیشنلزم کے شیطان کو مسلط کرا دینا ئے اسلام کی بھی کوئی خدمت نہیں ہے ...

اب ایک غلط فہمی اور رہ جاتی ہے جسے دور کردینا ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ملک میں کانگریس ایک طاقت بن چکی ہے اور ایسی طاقت بن گئی ہے جس نے سیاسی قوت و اقتدار کے تمام سرچشموں پر قابو پالیا ہے۔ اُس سے الگ رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم ان سرچشموں سے خود دستبردار ہوگئے اور دوسرے لوگوں کو آپ سے آپ ان کا قبضہ دیدیا۔ زیادہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر گھس جاؤ اور وہاں طاقت پیدا کرو۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ ہندو راج کے حامیوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمان سیاسی طاقت میں حصہ دار بن جائینگے۔ اور اس میں زیادہ سے زیادہ فائدہ کے بھی امکانات ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان سوشلسٹ گروہ کے ساتھ مل کر مہاسبھائی عنصر کو شکست دے دیں۔ اور یہ کہ مسلمان اپنی بالاتر تہذیب سے ہندوؤں کو متاثر کریں اور آگ کی طرح اُن کی تہذیب

ہندوؤں میں پھیلتی چلی جائے۔

یہ بڑی دل خوش کن باتیں ہیں۔ مگر ہمیں تنقید کر کے دیکھنا چاہئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور جنتِ حمقا کی ہوائیں کسقدر شامل ہوگئی ہیں۔

بلاشبہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے اور اس کے آئین میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ جو گروہ چاہے اس میں شریک ہو کر اقتدار کے مرکز پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کر سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ لبرل، کنزرویٹو، سوشلسٹ، کمیونسٹ جو چاہے پارلیمنٹ میں جانے اور وزارت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ نظری حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین چھوٹی جماعتیں مل کر ہر دوسری جماعت سے زیادہ طاقتور ہو جائیں اور مرکزی اقتدار حاصل کر لیں۔ لیکن یہاں سوال آئین اور اس کی نظری گنجائشوں کا نہیں بلکہ امور واقعیہ کا ہے۔ جو جماعت خالص جمہوری اصولوں پر بنی ہو اس میں کسی ایسی پارٹی کے برسر اقتدار ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں جسکی حیثیت دراصل قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) کی ہو، اور کثیر التعداد قوم کی تمام پارٹیوں میں جس کے خلاف قومی امتیاز اور قومی امپیریلزم کا جذبہ بطور ایک قدر مشترک کے پایا جاتا ہو۔ ایسی اقلیت نہ تو کبھی اکثریت بن سکتی ہے، اور نہ یہ اُمید کر سکتی ہے کہ کثیر التعداد قوم کی کوئی پارٹی اس کو برسر اقتدار ہونے میں مدد دیگی۔

ہمارے سامنے آئرلینڈ کی مثال موجود ہے۔ ۱۸۰۱ء میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی یونین (وحدت) عمل میں آئی اور دونوں قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری نظام میں شریک کر دیا گیا۔ دونوں کی ایک ہی پارلیمنٹ تھی۔ ایک ہی طریقِ انتخاب سے دونوں اپنے اپنے نمائندے منتخب کر کے اس جمہوری ادارہ میں بھیجتے تھے۔ اور جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے،

آئین میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی کہ آئرش نمائندے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے گورنمنٹ پر قابض نہ ہو سکیں یا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر وزارت نہ بنا سکیں لیکن فی الواقع ہوا کیا؟ اوکانل (O'CONNELL) جیسے آتش بیان خطیب اور ہوشیار قانون داں کی تدبیریں اور پارنل (PARNELL) جیسے قابل پارلیمنٹری لیڈر کی چالیں بھی کچھ نہ کر سکیں۔ انیسویں صدی کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن کیلئے بھی آئرش نمائندوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں اقتدار نصیب نہ ہوا۔ اور اقتدار تو درکنار وہ غریب کسی آئینی تدبیر سے ان مصائب کو بھی دور نہ کر سکے جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں ان پر نازل ہوتے تھے حتیٰ کہ آخر کار انکو باہر سے لڑنا پڑا، اور آج کی آئرستانی جمہوریت کسی آئینی جدوجہد کسی اندرونی تعاون کا نہیں بلکہ بیرونی جنگ کا نتیجہ ہے۔ یہی سبق ہم کو چیکوسلوواکیا کے جمہوری نظام سے ملتا ہے جہاں جرمن اور سلاوک اقلیتیں چیک اکثریت کے مقابلہ میں پارلیمنٹری طریقوں سے کچھ نہ کر سکیں۔ یہی سبق ہمیں یوگوسلیویا سے ملتا ہے جہاں کروٹس اور سلافینی آج تک کبھی کسی آئینی چال سے حکومت کے نظام پر قابض نہ ہو سکے۔ یہی سبق ہمیں امریکہ سے ملتا ہے جہاں ہر پارٹی حکومت پر قبضہ کر سکتی ہے مگر حبشی قوم کیلئے اسکا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہم جب تک مسلمان ہیں، یہاں ہماری حیثیت محض ایک سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ ایک قومی اقلیت کی ہے، وہ کانگرس پر قبضہ کرنے کے خواب جسقدر چاہیں دیکھتے رہیں مگر عقل سے نہیں سمجھتے تو تجربہ انہیں بتادے گا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔

بھول نہ جانا چاہیے کہ کانگرس کا اور ہمارا اختلاف محض ذرائع اور طریقوں (MEANS AND METHODS) کے اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اصول، مقاصد اور پالیسی کا بنیادی اختلاف ہے۔ اُسکے اصول قومیت و جمہوریت کو ہم بالکل بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسکے مقصد یعنی ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ کے قیام کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اسکی پالیسی، یعنی بتدریج سیاسی اختیارات

حاصل کرنے اور انکی مدد سے ہندوؤں کی بالادستی عملاً قائم کر دینے کو بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تینوں بنیادی چیزیں جبتک بدل نہ جائیں، کانگرس کیساتھ ہمارا تعاون اسلامی اغراض کیلئے ذرہ برابر مفید نہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ آیا کانگرس کے اندر جا کر ہم یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں؟

داخلی مقاومت یا تعاون سے کسی جمہوری تنظیم کے اصول، مقاصد اور پالیسی میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں، البتہ کسی حد تک تغیر ضرور ممکن ہے۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس جماعت کی رائے کو متاثر کر دیں، اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمامتر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

انمیں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابلِ عمل ہے کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگرس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ انکی بات اتنی ہی قابلِ التفات ہے جتنی اس شیر خوار بچے کی بات قابلِ التفات ہو سکتی ہے جو بے چارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

رہی دوسری صورت تو داخل میں منظم جدوجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگرس میں جتنے مسلمان شریک ہیں اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب، یا انکی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی، بلکہ ایک ٹیم بنکر رہے، انکی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ انکا کانگریس میں رہنا یا نکل آنا اسکے حکم پر موقوف ہو۔ مگر کیا

بحالات موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اسکا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں ظاہر میں ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے اور آزادی ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے انکے خیالات اسقدر متضاد ہیں کہ انکو ایک پارٹی میں منسلک کرنیکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے، اور حتمًا یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوسرا گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد۔ اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں۔ انمیں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کیلئے کتاب و سنت کی سند غیر ضروری ہے۔ بعض کو "مسلمان" کے سیاسی و معاشی مفاد سے تو ضرور دلچسپی ہے مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں، مگر اتنی نہیں کہ "ملک" کے مفاد کا جو تصور انکے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہل علم اور نیک نیت ہیں۔ کانگرس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اُٹھے گا، تینوں گروہ ایک آواز بلند کرینگے۔ مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئیگا تو یہ اسقدر بھانت بھانت کی بولیاں بولینگے کہ اسلام اور مسلمان دونوں غیر مسلموں کے لئے مضحکہ بنکر رہ جائینگے، اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائیگا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگرس میں بھرتی کر رہے ہیں، اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگرس کے ہندو کارکن بھی بھرتی کا کام کرنیکے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگرس میں جا رہے ہیں وہ ان تینوں گروہوں اور انکی بیشمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کانگرس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمامتر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں۔ خواہ وہ گاندھی جی ہوں، یا جواہر لال، یا کوئی سخت مہاسبھائی، بہرحال فطرۃً ان سب کا میلان اُن نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقادًا اور عملًا منحرف ہو چکے ہیں، اور جو اس وقت ہندوستان میں اسلام اور اسلامی قومیت کی جڑیں کاٹنے کیلئے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ کانگریس

اس لیے عزم وہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو"
(حوالۂ مذکور)

دیکھیے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہل قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں، ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر روسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بیچارا بچاؤ کی کوئی راہ نہ پاسکے، دنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتویٰ سنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کا اس قدر لطیف پیرایہ میں اوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حال زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیماکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کیے ہیں، جنکی رو سے دو مسلمانوں کے مقابلے میں ۳ غیر مسلموں کی رائے بہرحال صحیح ہے اور حکومت ہمیشہ اُسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیماکریسی کے اس قاعدہ کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھکر وہ غیر مسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمت آزمائی اور عمل" کے میدان میں داد مردانگی دے رہے ہیں، کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتحمندی" ہے مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیر مسلم اپنی "فتحمندانہ" پوزیشن کو محفوظ رکھنے کیلیے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب، کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کیلیے ہر ممکن تدبیر کرنی ہی چاہیے، مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود انکے اپنے بہت سے ممتاز افراد بھی اس معاملہ میں غیر مسلموں کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی یہ ڈیماکریسی کی لعنت تو ان کو نعمت نظر آتی ہے، مگر اس لعنت سے بچنے کیلیے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں،

کے ذمہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت اور منفعت اور اثر و اقتدار کے مناصب تمامتر انہیں منافقین کیلئے وقف ہیں اور رہینگے۔ انکے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابلِ ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے، اور اس گروہ میں سے بھی خصوصیت کیساتھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے باقی رہا تیسرا گروہ اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے، تو انکو محض آلہ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے جبتک یہ وفادار خدام کی حیثیت سے صرف رنگروٹ بھرتی کرتے رہینگے ان سے مداہنت برتی جائیگی۔ جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اس فوج کو ہشکار دیا جائیگا جو اسی دن کیلئے پرورش کی جارہی ہے۔ ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنیکی کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑیگی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے دینداروں کو بھنبوڑ کھائینگے۔ کیا ایسی حالت میں کانگرس کے اندر اسلامی مفاد کیلئے کوئی منظم جدوجہد کی جاسکتی ہے؟

اسکے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جہانتک اخلاقی اثر اور دلیل وحجت کا تعلق ہے، اسکے لئے کثرت تعداد کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور نصفت شعار ہے تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو صریح اور ناقابلِ انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے دیندار کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور زورِ استدلال سے کرالی؟ کیا وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرالیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچالیا؟ کیا اس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرالیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کیلئے قیام تعظیمی پر جو مجبور کیا جارہا ہے، کیا اسکا کوئی تدارک کرالیا؟ (اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہو کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ

وسلام بھیجنے ہی کیلئے قیام تعظیمی ممنوع ہے، اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے ؟ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لئے قیام تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرضِ بحث میں لایا جا سکے ؟ اسی پی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کے ساتھ جو مختلف قسم کے طرزِ عمل اختیار کئے، کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز باز پرس کسی ؟ حکومت کی طاقت سے اُردو کو دبانے اور ہندی کو اُبھارنے کی علی الاعلان جو کوششیں ہو رہی ہیں، کیا ان کو رکوا دیا، کانگریسی حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام مہاسبھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیئے گئے ہیں، کیا ان پر کوئی تو شہ احتجاج کر دیا؟ اگر کوئی کانگریسی مسلمان سخن پروری کیساتھ نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کے ساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کر سکتا ہے، تو سامنے آئے اور ضرور آئے۔ اور اگر اسکے پاس ہمارے ان سوالات کا کوئی جواب اسکے سوا نہیں ہے کہ "ہماری پشت پر دیندار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کرا سکیں"، تو ہمارا مدعا خود اسکے اپنے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف کو انصاف کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں ہے، بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر جھکانے والی ہے، لہذا اسکے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

ہمارا نصب العین اور طریق کار

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کے اشتراک عمل کی کوئی صورت نہیں ہے یا یہ کہ ہم ان کو نفس آزادی ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائینگے کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے، اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سن کر بے صبری کیساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں لیکن ہمارا مدعا در اصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں ہمارے سامنے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ اقوام کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہم آزادی وطن کیلئے جدوجہد کریں یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گذر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سر پھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصلی سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقا جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا، اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں پادشاہی، یا امراء گردی (ارسٹاکریسی) یا اور

کسی طرز کی حکومت ہونی چاہئیے۔ درحقیقت جو سوال ہمارے لئے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے، اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ ستر اسی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشو و ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرزِ ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے ۔ نفس جمہوریت کو اور اُس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہئیے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں ــــ اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہوسکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے سہنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئیے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے! اسی نظریہ کی بنا پر دستورِ حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونے والا ہے اُس کے لئے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے انگریز اپنے نزدیک اسی کو صحیح سمجھتا ہے اور اسکے پاس طاقت ہے جسکے بل پر وہ ہندوستان کو اس راستہ پر لئے جا رہا ہے۔ ہندو اپنے لئے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پر جانے کے لئے آمادہ ہے۔ اس صورتِ حال نے اُس کے لئے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو آزادی اور خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہو جاتے ہیں، لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ قباحت محسوس کرے، اور نہ اس کے لئے یا اس کے سرپرست انگریز کے لئے ان لوگوں کے

احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اسکی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ یہ اس راستہ پر جلدی بڑھنا چاہتا ہے اور دور تک پہنچ جانا چاہتا ہے، اور وہ اسکی خواہشات کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس نظام میں قباحت ہے، اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اسکی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، انکی جڑ کٹ جاتی ہے اسلئے کہ ہم شمار میں کم ہیں، اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے ان کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے، اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود ہی مٹا دیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورت حال نے ہم کو ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرلیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خود نفی کر دو، یا پھر اپنے آپ کو سپرد کر دو تاکہ یہ نفی کرنے کی خدمت دوسرے انجام دے دیں پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جکڑ جس میں لاکر ہم پھنسا دیئے گئے ہیں اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اسکو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں

جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچ کر ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف، نقطۂ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجئے جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کار آمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کار خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیق مقصد حیات، تعمیر ذہنیت، تشکیلِ اخلاق، تصویر عادات، اور فی الجملہ اس نیشنل ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے تعلیم کی اس تفصیلی صورت میں ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور اُن کی آئندہ نسلوں میں حسن سلوک ہو، سنجوگ ہو، شریفانہ ہمسائگی کے تعلقات ہوں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کے لئے کام کریں مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا تسلسل قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہمارا نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے، یا دونوں گڈمڈ ہو کر اسی برھمو سماجی یا کبیر پنتھی وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیم عمومی کے مسئلہ میں ہمارے اور ان کے درمیان کُلّی اشتراکِ عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان کیساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنا دے۔ ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوشحالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاح معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں۔ مگر اصلاح کے مفہوم و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب ہے، مگر تمدن کے قالب میں جو

روح کام کرتی ہے، اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ معین کرتی ہے وہ ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے — پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بین لوگوں کے لئے یہ کہدینا آسان ہے کہ اس سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداوری (MASS - PRO-DUCTION) نے قوموں کے حدود امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدنوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی ہے اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اسلیئے مل گیا ہے کہ وہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام لے رہی ہے۔ یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن پیدا کریگی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود امتیاز کو توڑ کر انکے گھروں تک گھستا چلا جائیگا۔ لہذا پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سُن کر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار نہ ڈال دینگے اور نہ اس بات کیلئے راضی ہونگے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کردیں —— خلاصہ یہ کہ ہماری اور انکی راہیں متوازی (PARELLEL) تو چل سکتی ہیں، اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں لیکن از اول تا آخر ایک ہو جائیں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں اور انکو ملا کر ایک ایسا نظام حکومت کیونکر بنایا جاسکتا ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو؟ ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کردیں اسے ایک مسلمان بھی مان لے، اور صرف اسلیئے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پرانے نظریہ ریاست نے جتنے حرم بنائے تھے ان سب کو توڑ کر شخصی زندگی تک میں گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں! اس کو مان لینے کے بعد تو لامحالہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں:-

(۱) اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو خود مٹا دیں۔

(۲) اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے عملاً بے دخل ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لیکر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچا لے، لیکن یہ تو اسکے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر نہ زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری نظام کی فطرت کیا ہے ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائیگا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائیگا۔ بڑی قوم کو بہر حال حاکمیت حاصل ہو گی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی قومیت سے دست بردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے، مگر چھوٹی قوم کیلئے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آجاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو درکنار خود اپنے اوپر بھی انکو نافذ نہیں کر سکتی۔ اسکو اپنے اصول تہذیب پر قائم رہ کر ترقی کرنے بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں مل سکتا۔ اسکے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے اسکی خودی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے کہ چاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کر لیں۔ کیا اسکا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اسکے لئے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کیلئے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لئے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں، مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں اسکے اندر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کیساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے مگر سوال یہ ہے کہ اشتراک عمل کی صورت کیا ہے؟ اسکی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کیلئے تو اشتراک عمل کرنے سے ہم انکار نہیں کرتے، مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی قبر کھودنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراک عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراک عمل کی یہ

کونسی بنیاد ہے؟ ہم نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے اور لڑ کر گذر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملنے کی صورت کیا ہے۔ ہم اسکے ساتھ اس صورت سے ملکر چلنے کیلئے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر وہاں قومی استعلاء و استکبار (NATIONAL INPERIALISM) کا بھوت سوار ہے اور مردم خوری کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کیلئے کہا جا رہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہو سکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے اُن بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے جو ہمارے خیالات کو سُنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو، اور متحدہ جد و جہد کا دروازہ بند کرتے ہو اور انگریزی امپیریلیزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنیکی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے اور اُٹھنے کا نہیں ہے، بلکہ اس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کیلئے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنا دے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکیگی۔ لہٰذا لاطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑ دیئے اور ایمان و احتساب نفس کیساتھ سوچئے کہ جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع یہ سوال ہندوستان میں امت مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اسکو حل کرنیکا یہی وقت ہے، اور اسکو آزادی ہند کا مسئلہ حل ہونے تک اُٹھا رکھنا موجودہ سیاسی حالات میں صحیح نہیں ہے تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکر سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہٗ ادا کرنیکی کوشش کرینگے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوگی کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا ہے۔

۱ - ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جوں کا

تسلیم کر دیا۔ ان جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے ہیں۔ اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صرف کیا کہ اس بد اصول دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفظ کا سامان کریں۔ یہ بنیادی غلطی تھی اور اب اسکے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ۔۔۔ ۔۔۔ اس پوری سیاست پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ جس دستور حکومت کی بنیاد ان اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ (WEIGHTAGE) نشستوں کا تعین، عہدوں اور مناصب میں حصہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جبکہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوت نافذہ عطا کر دی جائے۔ خرابی کی اس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اپنا پورا زور اسی کے استیصال پر صرف کرنا چاہئے۔ ہماری قومی سیاست کا اولین نصب العین اب یہ ہونا چاہئے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں، اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے دیں۔

۲۔ واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی بنا رکھی گئی ہے اور جس کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے کے لئے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لئے موزوں ہیں۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصول جمہوریت کی نفی ہے، عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی قیصریت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں ہم پر آزمایا جائے۔

۳۔ دو یا زائد قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی یہ تفسیر قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندۂ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونے کی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولت مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لئے بالکل بے معنی اور بے کار ہو گا۔

تو ارشاد ہوتا ہے کہ اکثریت و اقلیت کا سوال چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیما کریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ دو مسلمان، چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں، باطل پر ہیں اگر انکے مقابلے میں فرعون یا سامری کی امت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں، صرف اللہ سے ڈرانا چاہیے" اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیما کریسی کے اس قاعدے کو قبول کر کے تم "ہمت آزمائی اور عمل کے میدان" میں کود پڑوگے تو "فتحمند" ہوگے، ورنہ یونہی "پست ہمتی کی خاک مذلت" پر لوٹتے رہوگے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں ہمت کر کے اسے کھا جاؤ، انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا جو عین "فتح مندی" ہے، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا، اور لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کی طرح اصرار کرتے رہے، تو "اولوالالباب" تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں "سرکار برطانیہ کے ٹوڈی" کا طعنہ دینگے!

سب سے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کیلیے اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ پچھلے سال جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ کا علم اٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "مسلمانوں کو اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اسلیے کہ ادائے فرض کا غیر مشروط تقاضا یہی ہے"، مولانا اپنی تمام تقریر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اُس تحریک میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جائیں جسکی اساس وطنی قومیت اور ڈیما کریسی کے انگریزی نمونہ پر رکھی گئی ہے، یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں،

ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہو سکتی ہے اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے ۔ وہ اپنے بچے کا باپ ، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے ، اور اسلام ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے ۔ وہ اپنے اہل محلہ کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون، اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت ہی سے ہے ، اور اسلام ہی اسے ہمسایگی ، رفاقت ، تعاون اور برادری کے اصول و حدود بتاتا ہے ۔ انسانی تہذیب و تمدن ، معیشت و معاشرت ، اور نظم اجتماعی کے جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا ، مسلمان ہی کی حیثیت سے لے گا اس لئے کہ اس کے عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضا یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اسلام کے اصولوں پر چلے ۔ اس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصہ لے سکتا ہے ، در اصل اس سے یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتا ۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کا منصب نہیں ، مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لئے یہ پوزیشن کسی طرح قابل قبول نہیں ہے ۔ علاوہ بریں اگر عمومی حاکمیت کی تفسیر یہ کی جائے کہ ملک کی حکومت میں ہمارا حصہ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ ایک خانہ ہندستانیت* کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں ۔ بالفرض یہ تقسیم صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لئے جن وسائل و ذرائع ، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے

* کا ہے جس میں ہم حکومت کے حصہ دار ہیں ۔ اور دوسرا خانہ مسلمان ہونے کی حیثیت

لائیں گے ۔ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو مل نہیں سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے ۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے ۔ اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے ۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادی وطن کے بعد بھی آزادی میسر نہ ہو، اور ہماری تہذیب، کا نظام جس طرح انگریز کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادی ہند کے دور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے ۔۔۔ کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرہ برابر بھی فہم رکھتا ہو، اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا، اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا ۔ لہذا ہمارے لئے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصہ مسلم ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے ہونا چاہیے نہ کہ محض ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے ۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لئے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور انکے سیاسی نصب العین کا سنگ بنیاد قرار دینا چاہیئے ۔۔۔ ان میں یک سر مو بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ ان نکات سے ہٹنا در اصل موت کے گڑھے میں جانا ہے ۔۔۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستور حکومت اور کانگریس اور مہاسبھا دونوں کا نصب العین ہمارے ان نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ اسکو بالکلیہ رد کر دیں لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے ۔ یہ محض سلبی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی ۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہیے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کونسا دستور حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو، ملک کی دوسری قوموں کیلئے قابل قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے ہو سکتے ہوں ۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لئے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم

الگ الگ پیش کریں گے ۔

پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے :-

اولاً وہ بین الاقوامی وفاق (INTERNATIONAL FEDERATION) کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست ہو (A STATE OF FEDERATED NATIONS)

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونے والی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) حاصل ہو۔ یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لئے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔

ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لئے اس کا طرز عمل مساویانہ حصہ داری (EQUAL PARTNERSHIP) پر تعمیر کیا جائے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کیلئے وحدانی (UNITARY) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے بلکہ یہاں ایک اسٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، دوسرا پہلو انکی نگاہ سے اوجھل رہ گیا ہے ۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اسلئے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے، بلکہ انکی اندرونی خود مختاری کو برقرار رکھ کر انکے درمیان وفاقی تعلق قائم کرنا چاہئے۔ لیکن واقعات کے اس پہلو پر انکی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں ریاستوں

اور صوبوں کی طرح، قوموں کے درمیان بھی اصول تہذیب، طرز زندگی، روایاتِ قومی، اور ضروریات اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظرانداز کر دینے کی وجہ سے اُنہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں باندھ کر رکھ دیا، درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہوئے ہیں۔ ان سے زیادہ قومی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و مفاد رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا اُن کے لئے ممکن نہ ہو، اور اُس کیساتھ اُنکے کچھ مخصوص حالات بھی ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں ملکر اس طرح کی ایک مصالحت (COMPROMISE) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں اُنکی خود مختاری بھی برقرار رہے اور مشترک معاملات میں اشتراک عمل بھی ہو سکے۔ اس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزا کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جزو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں مختار ہوتا ہے۔ نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنیکا اختیار ہوتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹادے۔ اسطرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک ضروریات کیلئے ملکر ایک اسٹیٹ بنا سکیں۔

وفاق کی اس روح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کیلئے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اس نوعیت کا وفاق جسطرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے رکھنے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے، اسطرح قوموں (یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں) کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصول وفاق کا انطباق (APPLICATION) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پر ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طریقہ پر کیجاتی ہے، متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری چیز کو ہم "تہذیبی خود اختیاری" (CULTURAL AUTONOMY) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں:

(۱) وفاقی اسٹیٹ بنانیوالی ہر قوم صاحب حاکمیت قوم (SOVEREIGN NATION) ہو، یعنی وہ اپنے دائرہ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

(۲) تعلیم مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم ونسق اور مذہبی احکام کا اپنے افراد قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف انکی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی ومعاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرز معاشرت (NATIONAL SOCIAL SYSTEM) میں ہر قوم کو پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

(۳) ان اغراض کیلئے ہر قوم کی الگ الگ ضلعدار اور صوبہ دار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورۂ بالا مسائل ہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے انکے لئے قوانین منظور کئے جائیں۔ ان قوانین کا مرتبہ عام ملکی قوانین کے مرتبہ سے کسیطرح کم نہ ہو۔ انکو نافذ کرنیکے لئے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (EXECUTIVE) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جوابدہ ہو۔ مصارف نظم ونسق کیلئے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنیکے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں۔ اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کیلئے مقرر کردیا جائے جسطرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

(۴) متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جز اور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں ان کا تصفیہ وفاقی عدالت (FEDERAL COURT) کرے۔

(۵) اپنے مخصوص قوانین کے مطابق فصل خصومات کرنیکے لئے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اگر ان پر اتفاق ہوجائے تو انکا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (CONSTITUENT ASSEMBLY) میں بنایا جاسکتا ہے[1]

(۱ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں کے وفاق کا مرکز نہیں ہے بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظام حکومت جسے متوافق قومیں اپنی مشترک اغراض کیلئے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اسیطرح مرکزی ہے جسطرح وفاقی مرکز (FEDERAL CENTRE) یہ مشترک نظام حکومت لامحالہ "مساویانہ حصہ داری" کے اصول پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ یہ حسب منشا حاکمیت قوموں کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی نظام حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کیساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑیگا کہ اصول جمہوریت کے لحاظ سے ایک وفاقی جزو کو جو حاکمیت حاصل ہے، دوسرا وفاقی جزو اسے سلب نہ کرلے۔ تہذیبی خود اختیاری کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بنا کر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

(۱) اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی، چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ ؎ (حاشیہ اگلے صفحہ پر) اُس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کردیا جائے جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہوسکتا ہو۔ پاسنگ (WEIGHTAGE) کا طریقہ بالکل اُڑا دیا جائے۔

(۲) موجودہ طریق انتخاب کو بھی بالکل بدل دیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب بنانیکے بجائے ایک ریاست کے پورے حدود ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کیلئے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں بلکہ تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں (RECOGNISED POLITICAL PARTIES) اپنے اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور انکو کامیاب کرنیکے لئے جدوجہد کریں۔ اس صورت میں (اور یاد رکھئے کہ صرف اسی صورت میں) جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کردینا چاہیئے، اس لئے کہ پھر بند حلقوں میں رہنا ہر قوم کے لئے

(حاشیہ ؎ بعض جہلا اس موقع پر فوراً بول اٹھتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کیلئے جو حدیں مقرر ہیں، یا ہندو شاستر میں جو مخصوص قوانین ہیں، کیا انکو جوں کا توں نافذ کیا جائیگا؟ یہ سوال سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کیلئے ہم صرف ان قوانین کے نفاذ پر زور دینگے جو عام ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اسکے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کرکے اور انکے حق میں علمی و عقلی دلائل پیش کرکے رائے عام کو ہموار کرنیکی کوشش کرتی رہیگی اور جسکی تہذیب کے اصول زیادہ طاقتور ہونگے وہ عام ملکی قوانین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجائیگی

مضر ہوگا جداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت صرف اسیوقت تک ہے جبتک کہ یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیمو کریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (PROPORTIONAL REPRESENTATION) کے جو تجربات کئے گئے ہیں، اگر اُن سے استفادہ کرکے ایک زیادہ صحیح جمہوری طریق انتخاب اختیار کر لیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کو اڑا دینا ہوگا تاکہ اوّلاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص کا اشخاص سے نہ ہو بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنے اصول اور پروگرام لے کر سب قوموں کے پاس جا سکے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لئے کچھ زیادہ مضر نہ ہوگی، اور مزید براں کھلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے۔

(۳) جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لئے استصواب عام (REFERENDUM) کا طریقہ اختیار کیا جائے نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو انکو واپس بُلا لیں۔ یہ بھی انگلستان کی دقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معین

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ؏ خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصے مقرر کرنے سے مناصب حکومت کی اہلیت (EFFICIENCY) متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے، اور اسکا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اپنے حق سے زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں۔ وہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے کہ وہ نظام حکومت کو چلانے کیلئے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی نہ دے سکتی ہو۔ حصہ کے سوال کو یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدار انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

مدت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں۔ روسو کے بقول انگریز صرف اُس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں اور جب وہ انہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

(۴) استصواب عام کیساتھ یہ اصول مقرر کر دیا جائے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلس قانون ساز میں پاس نہ ہو سکے، کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اسکو اپنے لئے مضر پاتا ہے اور دوسرا حصہ دار صرف اس لئے اس کا مؤید ہے کہ وہ اس کے لئے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہوگا۔

(۵) استصواب عام کے لئے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑیگا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم اسقدر فی صدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

(۶) دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہونگی جن کے لئے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قوموں کے لئے الگ حدود اراضی مقرر کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلۂ آبادی کے لئے مقرر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم سے کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ ملکر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائینگے، بلکہ اس کو ترجیح دینگے۔

میرے دوست ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل

(CULTURAL FUTURE OF INDIA) پر جو مقالہ حیدرآباد سے شائع کیا ہے وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رو سے مشرقی بنگال، حیدرآباد، بھوپال، جوناگڈھ، جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی و اودھ، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کرکے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو اُن کے لئے بلحاظ اُن کی آبادی کے مستقبل رقبے معین کئے جاسکتے ہیں (بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دیکر اُن کی آزادی رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں) اسیطرح سکھوں کو بھی اُن کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جاسکتا ہے۔

تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر مجبوراً ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور اُن کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (CONFEDRACY) ہوجائے جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات (COMMUNICATIONS) اور تجارتی تعلقات کے لئے مقرر شرائط پر تعاون ہوسکے۔

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کئے ہیں، اُن میں سے جس کو بھی قبول کرلیا جائے اس پر ہم مفاہمت کرسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کرسکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور اُن کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن

اور ہر وہ نظام حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو کسی حال میں ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بنیادی غلطی سے پاک کرکے جو دستور بھی پیش کیا جائے اُس کو اور صرف اسی کو زیر غور لایا جا سکتا ہے۔

اپنے قومی نصب العین کی اس تشریح کے بعد ہمارے لئے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے کا موقع نہیں مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لئے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گذشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور نا عاقبت اندیشی سے کام لیا ہے، اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجہ کے دانشمند اور مدبر رہنما میسر آگئے ہیں۔ اس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور اُن کا پلڑا بہت جھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب ہو چکے ہیں، اور متعدد اسباب سے، جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، انگریز بھی دانستہ و نادانستہ وہی طریق دستور سازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے جو سراسر اُنہی کے لئے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہا درجہ کی خام خیالی ہوگی کہ محض نذر استدلال یا افہام و تفہیم سے یا آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو انکے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدل ڈالنے پر آمادہ کر سکینگے جو نہ صرف اُنکے عقیدے میں درست ہیں بلکہ انکی اغراض کیلئے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کیلئے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارلیمنٹری اور کونی ٹیوشنل لڑائی ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جا سکتی ہے۔ جبتک ہم یہ ثابت نہ کر دینگے کہ یہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ سروں پر نہیں بلکہ صرف ہماری قبروں ہی پر نافذ کیا جا سکتا ہے،

اور ذلت کی موت مرجانے والے ہیں - پوری تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کیے بغیر چارہ بھی نہیں :

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگرس کی شرکت سے اسلیے انکار کردیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے - انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائیگی، ہندوؤں کیلیے مفید ہوگی، مسلمانوں کیلیے مُضر ہوگی، چنانچہ ۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سرسید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا....

"اب ملک اصلاحات کیلیے بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے - ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کیلیے ۱۸۸۸ء والی بات سود مند نہیں ہو سکتی - ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے - چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑ جاتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں.......

"انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائیگا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کردیگی.......

"ان خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جارہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قویٰ کے سب سے پہلی طاقتور جماعت ہیں! اور پھر ان تمام خطروں کا

اور جبتک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتا دینگے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کیلئے مرنیکی طاقت رکھتا ہے' اُسوقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک خوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا' اور نہ وہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونیسے باز رہیگا۔ جس کے لانے پر انگریز' ہندو' اور ہمارے منافقین اور بہت سے صم بکم عمی فہم لا یعقلون مل جل کر کوشش کر رہے ہیں یہ مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہونگے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھینگے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ اُنکو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لینگے۔ وہ اُن لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں' جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے' جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لئے بلند آہنگیوں کیساتھ لیتے ہیں کہ ایوان وزارت پر اُن کا قبضہ رہے' جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے' جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کیلئے تیار ہیں' اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ اُن کی کشتی کو بھنور سے نکال لینگے' تو میں پیشینگوئی کرتا ہوں کہ اُنکی کشتی ڈوب کر رہیگی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو اُن کو اور خصوصاً اُن کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لئے بھینٹ چڑھانے پر تیار رہنا چاہئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسکا کیا جواب دوں۔ جبتک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کا عزم صمیم اُس میں پیدا نہ ہو جائے' انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے' اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

انسداد کیونکر ہوسکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک ریزولیوشن پاس کردے - جونہی اس نے ریزولیوشن پاس کردیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے معاً چھٹ جائیگا ......

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے - اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلاسکتے ہیں - اگر فی الحقیقت انکی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے اور تحفظ کی راہ اسکے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلا دینے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو انکی ٹھنڈی رگوں کو گرم کرسکے، تو میں کہونگا ایسی زندہ نعشوں کیلیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں ......"

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشأۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا - اس قوم کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو کبھی "الہلال" و "البلاغ" کا ایڈیٹر تھا وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے ــــ مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے، مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

(۱) "سیاسی اصلاح و تغیر کے معنی محض اُس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کیے ہوئے جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے - ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح و تغیر کی مخالفت کی" ــ یہ بات اُس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت و نیابت کو اپنے لیے مفید پاکر قوم پرستانہ جوش کیساتھ قبول کرتا ہے - مگر وقت

کی جادوگری کا تماشہ دیکھیے کہ اس نظریہ کو مولانا ابوالکلام بیان فرمارہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ فی نفسہ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

(۲) "مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری و نیابتی ادارات کے نمونہ پر کی جائیگی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کیلیے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کیلیے مضر ہوگی" ـــــ سیاسیات کا ایک طفل مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اُس بات کو قبول کر لیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر جان بوجھ کر ہمیں بے وقوف بنانے کیلیے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری و نیابتی اداروں کو یہاں ہمارے سر پر منڈھا ہے انکی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے، اور ان کو جوں کا توں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمراں اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہذا سید احمد خاں مرحوم کے دور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جا سکتا ہے تو وہ انکی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کیلیے انہوں نے اختیار کی، اور اس کو بھی اُس زمانے کے حالات سامنے رکھ کر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحبِ فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیے۔

(۳) "مسلمانوں نے کانگریس سے علحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالوِن نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی" ـــــ مولانا کو شائد خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رِپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریزی مدبرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پٹابھی

سیتا رامیا ہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھ لی ہوتی تو شائد اپنی قوم کے دامن پر دھبا لگانے کیلیے ہندوؤں کے کارخانۂ روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے ان کو کچھ نہ کچھ تامّل ضرور ہوتا۔

(۴) "اب ملک اصلاحات کیلیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے" ـــــ یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدیدہ کو قبول کر کے الکشن لڑائے جا چکے تھے، امپیریلسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کیلیے کانگریس اپنی خدمات پیش کر چکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے۔ پھر جب اپنے عمل سے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحات اور ان اصلاحات کیلیے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کیلیے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کیلیے لے رہا ہے، تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اسلیے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا منہ کالا نہیں کیا جا سکتا، مہاسبھائی ہندو کو تو ضرور زیب دیتا ہے" مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

(۵) "مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریزی سنگینیں انکی حفاظت کیلیے ہندوستان میں موجود رہیں۔ یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس انکو تحفظ کا زبانی اطمینان دلا دے" ـــــ یہ بات بھی ایک ہندو امپیریلیسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابو الکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اُسی نقطہ پر جمع ہو گئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں، "انقلاب" کا ڈراما ختم ہو چکا ہے، اور اسکی جگہ وہی دستوری ارتقاء کا نصب العین برسرکار آگیا ہے جو ابتدا سے اسکے پیش نظر تھا۔ "دستوری ارتقا" کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اسکی جگہ لینے کے لیے کافی طاقتور اور کافی قابو یافتہ نہ ہو جائے۔ اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ

انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف - بلکہ وہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی رسیاں کھول کھول کر اُسکے ہاتھ پاؤں باندھتا جاتا ہے - یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے، مگر مولانا ان کو اُلٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دور کیوں بھاگے جا رہے ہو! ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اسکے پھندوں میں دے کیوں نہیں دیتے!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے، اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں، اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں - جو تصویر اپنی اغراض کیلیے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اسکو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے - کون کہہ سکتا ہے کہ مولٰنا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد صاحب یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں - فضا جن خیالات سے بھر دی گئی ہے، وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں - یہ ایک جادو ہے، جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے، اور کیا بتائیے کہ کیسے کیسے عالی مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے - فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصور قومیت کو پیش نظر رکھکر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں "نیشنلزم" یا "قوم پرستی" کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک "قوم" ہے، اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے

فرقے ہیں۔ "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں، اور یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہاد مقدس میں کود پڑنے سے احتراز، بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہوسکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طوفان کے شور و ہنگامہ سے دماغ اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کیساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، عالی حوصلہ، حریت پسند اور جنگ آزما قوم کو برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایان شان حصہ لینے سے روک رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے اتنے طعنے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اسکی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شائد یہ مسلمانوں کا قصور ہو، تو اسکی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ شائد اس "جنگ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو، شائد یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اُس جنس کے شیر نہ ہوں جس سے "اسد اللہ" میل کرسکتا ہے اور کرتا رہا ہے، شائد اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کررہا ہو کہ اِنکے ساتھ چلکر میں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکونگا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے۔ پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو اور کیا ہے جسکی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جارہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور کھویوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں آتا کہ اسکا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ صفحات میں ناقابل تردید واقعات و شواہد سے ثابت کرونگا کہ فی الواقع صورت حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اسی صورت حال نے اپنے اہلِ وطن کیساتھ سیاسی جدوجہد

میں حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح کام رہا ہے، اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اسکے مفاد اور اُن اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا اسکے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف .... اس بحث میں میرے پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ اُن حضرات علماء کو انکی غلطی پر متنبہ کروں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انکو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہِ حق پر گامزن ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونیکے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اسکے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریق کار کو وہ بالکل صحیح طریق کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنیکے بعد میں ان سے درخواست کرونگا کہ اسکو ٹھنڈے دل سے پڑھیں انصاف کی نظر سے دیکھیں اور اس نورِ علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانونکی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے تو انہیں بلا لحاظ اس کے کہ

غلط راستہ پر کتنی دور جا چکے ہیں، الٹے قدم واپس ہونا چاہیے اور راہ راست معلوم کرنیکے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقل سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں، تو میں ان سے مطالبہ کرونگا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں۔ محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گذشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا، یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے احقاق حق یا ابطال باطل ہوا کرتا ہے۔ براہِ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آئیے۔ جو حقائق میں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کر کے دلیل و حجت سے ——— حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت ——— ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اُس احساس ذمہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جسکی بنا پر وہ اپنے آپکو اپنے ہر عمل کیلیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ پھر اسکا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابل ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں بھی شامل نہیں اور اس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کیطرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اسکے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہدینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ خطاب ائمۂ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے۔ اُن جاہل مقتدیوں سے میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس اول نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ انکی خواہشات کے خلاف کہہ رہا ہے جوابی بحث، اور بحث بھی نہیں بلکہ (۳۱) بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔

غلط فہمیاں اور خام خیالیاں[۱]

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سُن کر بے خود ہو جائینگے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اُس راستے پر چل کھڑے ہونگے جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہشمند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ، بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کیلیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شائد کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادّہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت اُسی سے چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے، اسلیے نہ صرف فطرۃً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادیٔ وطن کا خواہشمند ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے مراد کیا ہے؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی

ہے؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے، یا کسی غرض کیلیے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے؟ اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے الٹی فوت ہوئی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑی چلی آئیگی؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو؟ اور کیا اس قسم کی آزادی کیلیے جنگ اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رو سے بھی کسی قوم کا فرض ہوسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے، اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظر انداز کرکے خواہ مخواہ اُس بگل کی آواز پر لیفٹ رائٹ شروع کردے جو شیوگاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادی وطن" سے مراد ہمالہ اور گنگا و جمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہینگے۔ دراصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادی وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵ کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں "آزادی وطن" صرف اُسی آزادی کو کہا جاسکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ باشندوں کے لیے آزادی ہو۔ اہل وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جنکے باشندوں کا ایک حصہ آزاد اور دوسرا حصہ خود اپنے

اہلِ وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا بلکہ صرف ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اُس ملک کے باشندوں کی غلامی سے ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں۔ آج امریکہ کو آزاد ملک کہا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اسکے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لیے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اسکے فرنگی باشندوں کے حصہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتہً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کیلیے ہے۔ سامیوں کیلیے نہیں۔ چیکوسلوواکیا کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلاوک باشندوں کیلیے مخصوص تھی دوسروں کے لیے نہیں۔ ایسے ممالک کو اگر عرف عام میں آزاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیرینی نہیں بن جاتی جو اُن کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومت خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر ملک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو، اگر اسکی نکیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اٹھائے اور بٹھائے

اور جس طرف چاہے اسے چلائے جائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے، تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا۔ اسکے لیے ملک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہر حال ایک ہی چیز ہے۔ اُس میں اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہلِ وطن کی۔ اگرچہ تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اہلِ وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے، مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہلِ وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا اسٹالینی اپنے غیر اسٹالینی یا غیر اشتراکی اہلِ وطن سے کر رہا ہے، اسکو کوئی نسبت اُس طرزِ عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے، تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہر حال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے کی کوشش ہی کرنی چاہیے۔ پس جو شخص اہلِ وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو، اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگِ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے وہ دراصل جنت الحمقاء کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحب عقل انسان اسکی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بے وقوف ہو سکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کیلیے میدانِ جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو مجرد اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کیلیے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی

مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب ملک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہوجائینگے"۔ لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو، مختلف گروہ اور اُن گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات و احساسات (Sentiments) رسوم و رواج، قوانینِ معاشرت اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں، یا کم از کم باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہوجانا ہی تمام باشندگانِ ملک کا آزاد ہوجانا ہے، کیونکہ وہاں اہل ملک میں الگ الگ گروہوں کا وجود ہی نہیں ہے جسکی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ آزادی ایک گروہ کے پاس اٹک کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ یا زبان، یا عقائد، جذبات اور طرزِ زندگی کے بیّن اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اُچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کردے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنیکا کونسا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، اور جس آزادی کیلیے جدوجہد کی جارہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہوجائے کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جارہا ہے جو اُس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہورہی ہے جنکی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہوجاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسی جنگ آزادی میں حصہ لیگا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا ہی حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کیلیے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی

ہے، اور جس گروہ کیلیے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اسکے حاصل کرنے میں حصہ لے؟

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ ملک کی خوشحالی ہے، اور یہ خوشحالی جب آئیگی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہونگے۔ تعلیم عام ہوگی، تمدن ترقی کریگا، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوگا، معیار زندگی بلند ہوگا، اور اقوام عالم کے درمیان اہلِ ملک کی عزت بڑھیگی۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہونگے۔ پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو اور کیوں نہ وہ انکے حصول کیلیے مل کر جدوجہد کریں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کیلیے آزادی ناگزیر ہے، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور انکے امتیازات مانع ہیں، لہذا کوشش کرنی چاہیے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہل ملک کو ایک کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہینگے ملک آزاد نہ ہو سکے گا، اور جب تک ملک آزاد نہ ہوگا، تمام اہلِ ملک، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں بدحالی، افلاس، جہالت، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہینگے۔ کیا تم ان حالات کو دائماً برقرار رکھنا چاہتے ہو؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد، جذبات، طرز زندگی، زبان، ادب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کیلیے مل رہا ہے یا نہیں؟ اُن کیلیے زندگی کی ضروریات پوری کرنے، اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے

کے مواقع موجود ہیں یا نہیں ؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے ؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگان ملک سے یکساں ہے اور ان میں اُن سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جن کا تم ذکر کرتے ہو۔ لہذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے اور تمام باشندگان ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہیے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقاو قیام اور عروج و ارتقاء کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مشنری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہش نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اُس دور سے ہزاروں برس آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اسکے لیے اپنی ہزار ہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو الٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اُسی دورِ وحشت و حیوانیت کی طرف پس پا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت

ہیں اس کی عقل، اسکے مذاق، اسکے علم اور اسکی قوتِ اجتہاد و اکتساب کے ارتقار سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں - ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کر کے اُس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے اور اُس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National type) بنا چکی ہے جو صدیوں کے نشو و نما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے - اب ایک قوم کی زندگی دراصل اسکے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اسکے نیشنل ٹائپ کا مر جانا خود اس قوم کا مر جانا ہے - اگرچہ ضروریات زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ہر قوم کیلیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا - لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریۂ زندگی، اسکے ضابطۂ اخلاق، اسکے اصول معاشرت و تمدن، اور اس کے معیار قدر و قیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے - ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے - آپ محض "ضروریات زندگی" کا نام لے کر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ انکے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کر دے، کیونکہ اسکی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے - کوئی قوم جسکی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی - اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اسکے متعلق یہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا -

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجیے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے نیشنل

ٹائپ کی حفاظت اور اسکے نشو و ارتقاء کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدأ ہے - جو قوم غلام ہوتی ہے تا وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اسکے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہوتا جاتا ہے - اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا ہی نہ ہوگی - اور جس قوم میں آزادی کیلیے تڑپ پائی جاتی ہے، اسکی اس تڑپ کا کوئی سبب اسکے سوا نہیں کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہشمند ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بے وقوف آدمی ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لیے کہیگا - اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوسکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے، اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کریگی - کیا کوئی شخص مرنے کے لیے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص نقصان اٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لیے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اسکی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کیلیے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اسکی مطلوب ہی صرف اسلیے ہوسکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے۔

بلاشبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے - لیکن اسکے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں، وہاں مجرّد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا - وہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑیگا

کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کیلیے آپ کے پاس خالص جمہوریت کے اصول ہوں جنکے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں، تو لا محالہ یہ آنے والی آزادی صرف اس قوم کیلیے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کیلیے اس کے معنی بجز اسکے کچھ نہ ہونگے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہوجائے۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کرسکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکیگا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لیے صرف اسی وقت کشش پیدا ہوسکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایسا نقشہ انکے سامنے پیش کیا جائے جس میں انکے لیے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو، اسلیے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کیلیے کچھ کرسکتی ہے، اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جسکے لیے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

رہا یہ قول کہ ملک کی خوشحالی میں تمام باشندگان ملک کا یکساں حصہ ہوگا، خواہ ملک کا نظام حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو وہاں ترجیح ہم جنس لازماً موجود ہوتی ہے، اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا، بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہوجاتا ہے۔ وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اسکے ہاتھ میں دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی، اور نہ انتظامی

وتشریعی ادارات میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے۔ جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کیلیے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانے والا اور کھانا بیچنے والا اسکا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دوکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے، یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیم دولت اور معیار زندگی کی ترقی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے، اور محض آسائش جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتی کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے نظریات معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لیگی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا، اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کردیگا کہ جس طرح چاہیں اسکے لیے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کردیں، درانحالیکہ یہ سوال اسکی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان

سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس نام کو سنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئینگے، اور جب انکی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بزدلی اور رجعت پسندی اور سامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس قدر خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات واوحام میں گم ہو کر اپنے قومی مفاد کو بھول جاتے ہوں۔ اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جاسکتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ مگر ایک پوری کی پوری قوم نہ اندھی ہوسکتی ہے اور نہ بے وقوف۔ وہ کسی آواز پر دوڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بلایا جارہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پکار پر فریفتہ نہیں ہوسکتی بلکہ عین اسکی عقل اور فطرت کا اقتضا ہے کہ اس پکار کی حقیقت پر غور کرے، اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کیلیے کونسا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، اور یہ پکارنے والے جس آزادی کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔

قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک کتاب ایسی موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اسکے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریقِ حصول کے متعلق "قوم پرست" جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہر لال کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جسکی گہرائیوں تک یا تو ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اُس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کرونگا، تاکہ اس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض

کرتے ہیں - تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے انکے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اسکو ایک ہی قوم ہونا چاہیے - وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے - جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے - اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں - اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے، ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے، اور اس اشتراک ہی نے انکے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے - ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس، رشتۂ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے - یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں :-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے - اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے ...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشو و نما نہ پا سکے" (میری کہانی - جلد دوم - صفحہ ۱۳۱، ۲۳۲ - مکتبۂ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے

ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ـــــــ آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصور قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اُس کے نزدیک، جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

> "دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (ص ۴۵)

اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں

ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا" (صـ ۱۴۱)

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں، بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے :-

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے" (صـ ۴۳۱)

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے" (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو

مسلم اور دوسرے فرقے پیدا کیسے ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ انکے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اسکی ذہنیت اور اسکے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے — عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے — قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرز خیال اور طریق زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانیکا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے۔" (ص ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کیساتھ

کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو"؟ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لاکر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور انکے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کیلیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کیلیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھکر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کیساتھ حل کرنے سے انکار کرتے

ہیں، اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آجاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کیساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے، بلکہ یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں :-

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اُسے انہوں نے خوب کھیلا" (ص۲۲)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے" (ص۲۳)

"اغراض کے اس ہجوم میں .... برطانوی ہند کے نمایندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی۔" (ص۲۱)

"اصل دقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی۔" (ص۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اسکی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آجکل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہا سبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں۔" (ص۱۷۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے" (ص ۳۱۱)

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے اندازِ فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں انکا اندازِ فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے، اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنیکی زحمت کون اٹھائے؟ اسکا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے "ہندوستانی قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کیلیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار، زمیندار، اور تمام مستقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کیسا تھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کیلیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے، تینوں باہم قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابلِ نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:-

"منظّم مذہب (Organised Religion) بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہوجاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اسکا رویہ یہی ہے" (ص ۱۶۷-۱۶۸)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کیساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱۱)

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اسکے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔" (ص ۳۹۴)

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جسکے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے[1] اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔" (ص ۴۱۶-۴۱۹)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لیے قوم پرستی کا

[1] مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا، مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں۔

تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہیگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ پیدا ہوجائے[۱]" (ص ۱۴۵)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کر لینا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے، یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہوجائیگی، اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ موثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنے جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھائے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہوجائیگا[۲]" (ص ۵۶-۵۸)

---

[۱] یہ مقام ذرا سی تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے، جسکی تشریح بابو سوباش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کی ہے۔ جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہوجائے، کسی ایک ملک میں اسکا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور انکے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سر دست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو۔ سب سے پہلے اپنے ملک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کیلیے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے۔ پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں انکو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے[۱]" (ص ۵۵ ۴)

"سوسائیٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی۔" (ص ۴۶۹)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کیلیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔ قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائیگا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہوگی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ

[۱] ڈیماکریسی (جمہوریت) کے اس تصور کو خوب (۵۴) سمجھ لیجیے۔

ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اس اشتراکی انقلاب کیلیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں - مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکینگے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں - لہذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں - اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے :-

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں - اسلیے کہ انکے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائینگے - (ص ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے - لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے - سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جسکی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کیلیے تیار نہیں ہو سکتے - پھر اسلامی تہذیب کیساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے، کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اسکو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے - اسکے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے جسکی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں - ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشۂ جنگ بنایا ہے -

اُن کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں، اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف "ہندوستانی قوم" ہی پائی جاتی ہے، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے، اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے[۱]" (ص ۳۳۱)

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"۔ (ص ۳۳۲)

[۱] جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود اسلامی قومیت کے خلاف یہ طرزِ استدلال اختیار کر رہے ہیں، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کے خلاف محض سیاسی چال کے طور پر یہ طرزِ استدلال اختیار فرمایا ہے۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ "تمام دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ"۔ اسکی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کے اشتراکی کا کامریڈ (رفیق) ہے اور خود اپنے وطن بلکہ شہر، بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اسکا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال بھی اس تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اسکے باوجود وہ اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے :-

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو۔"[1] (صـ ۳۳۳)

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۔ قائم ہوئی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصد زندگی اور ایک اصول اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں، ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو اور اسکے خلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم محلہ کیا معنی، ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے۔ ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لامحالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے اسلیے وہ قصداً ٹھیک اُسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور اعتراض کیلیے ان دلائل سے کام لے رہے ہیں جنکی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے!

[1] تہذیب کے متعلق اسی قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبۂ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اسکا جلوہ شاعری، فن تعمیر، سنگتراشی، مصوری اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنکا مجسّمۂ تہذیب

اور انہی کی طرح ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں: ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کیلیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان شاذ ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علیگڈھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا)۔ مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں۔" (ص ۴۳۵)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰ - ہے۔ کیا ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بین فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لے لیجیے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو آج ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گاتے ہیں یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گاتے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فن تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں؟" ("مدینہ" مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء)

"ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے؟" (حوالۂ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ سیاسی فریب کاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ اسلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفسِ تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے (۵۸) اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول صفحہ ۱۰۸ تا ...)

(۵۸) حاشیہ صفحہ ۵۵ ملاحظہ ہو

یہاں تک تو صرف یہ وعظ تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ اسکے بعد دوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دینگے، اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں:۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے...... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" (ص ۳۳۲)۔

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور انکے بہت سے خیالات جنکی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی، ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جسکے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اسکو دور ہی لیے جا رہے ہیں... مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیار کیلیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے" (ص ۳۳۶)

حاشیہ صفحہ ۵۸: ۱؎ یہاں مسلمانوں کے اور ان قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے، اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لیکر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اس امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں اور ہمیں اب اس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیش نظر ہے۔

۱؎ اسلام کو بر سر انحطاط، بلکہ بزعم خود فنا پذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کیلیے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدہر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانینگے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اسکی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے (صفحہ ۳۳)

"مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت۔" (صفحہ ۳۳)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں، برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟" (صفحہ ۳۳)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی لیڈر" نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے

تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا ـــــ یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مُہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظام اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں تاکہ اس کو درہم برہم کر کے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کر لیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی.. سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کیلیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں، اور ان کو ایک لمحہ کیلیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اُس تہذیب کو خیر باد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا، یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا، اور اس غرض کیلیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہیگا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے

اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اسکے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ـــــ اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ـــــ بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اُس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے" (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:-

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر دتوں فرقہ دارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کیلیے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑیگا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ دارانہ مسئلہ بن گیا ہے اسکا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم، کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو

تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں۔ ان کو سامنے رکھکر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے۔ تو صاف نظر آجائیگا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں، سیاسی اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑپن سے کام لیا تھا۔ اُنھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو، تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے، لہذا کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس انشترا کی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ــــ ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیر مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات گذشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھکر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ با اثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جواہرلال کے بعد انہی کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص، سوباش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات بڈھوں کے ذاتی خیالات نہیں رہے ہیں بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے، اور ہر اُس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی توضیح کیلیے میں صرف دو مثالیں پیش کرونگا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

پچھلے سال لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے :-

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کیلیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائیگا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیان ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جسکو ہمارے آقاؤں نے اسقدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اس وقت بیکار ہو کر رہ جائیگا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لینگے۔ لہذا مسٹر نقوی کو مستقبل کیلیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"

آگے چل کر اس مضمون میں انگلستان کے اُن ملاحدہ کو مثالاً پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اسکی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۴ر اگست ۳۸ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت

کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے گئی اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا۔ میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ تو کھانا کھایا نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دونگی۔ چنانچہ میں اسی دن لڑکر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جب تک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔"

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہمکو بہت تنگ کرتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ اور آپ ہمارے پوجیہ پنڈت جواہر لال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو اور محض ایک جعل ہو۔ لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علمبردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں، "آزادی کی فوج" کے لیے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں، اور کم از کم کس حد تک اصولِ اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے، بلکہ

خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کیلیے آلۂ کار بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہل قلم اور مسلمان رسائل و جرائد اُنہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کیلیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس کیلیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو، میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استناد کرونگا جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" یا ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبہ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشوو نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء)۔

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" —— مجموعۂ ضدّین —— کی معراج تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے

جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی - مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اس نامبارک دور کے جو حالات بیان فرمائے ہیں ان کو پڑھیے تو آپ کو اسکی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہوگا - یہ پہلا فتنۂ عظیم تھا جس نے پوری طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی - اُس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اٹھے تھے - حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ نے اسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا - اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے دارا شکوہ کی صورت میں جنم لیا - اسی زہر کو دور کرنے کیلیے عالمگیر پچاس برس جدوجہد کرتا رہا اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا - مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پُرانی تحریک کی نشاۃ ثانیہ ہے، لہذا یہ لوگ اس فتنۂ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiration) حاصل کرنے کیلیے اُسی کی طرف رجوع کرتے ہیں - ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ، ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لایق ہے - ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلیے وابستہ کرلیں —— پنڈت جواہر لال بھی اسکے سوا کچھ نہیں چاہتے -

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں :-

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے ؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ

"اقوام" بستی ہیں - کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علحدہ علحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند (Commonwealth) میں صرف انسانی اور مادّی امداد کیا کرے ؟ اگر مسئلۂ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس بالکل ناکام رہی ہیں ....

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے از منۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیے بلکہ ہمارے پیشوں اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے - بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کیلیے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں - اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیے"

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہوگیا ہے - صوبۂ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کیساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگراں بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو - اُسکا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے - ہم آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کر سکیں - اور وہ آزادی اس لیے چاہتا ہے کہ ابتک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے، یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندوستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ

غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ " رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے ۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ " اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے ۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں ۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ ہر" قوم علٰحدہ علٰحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادّی امداد کرے"۔ برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ " مسلمان اسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور راز منۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی"، یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کیلیے تیار ہو جائیں ۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے ؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر۔ غالباً یہاں " اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی ۔ این ہم غنیمت است !

کیا جواہرلال نہرو کا تصور قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے ؟

مسلمانوں کو اپنے نام " مسلم" پر بڑا فخر ہے ۔ خدا کا رکھا ہوا نام ، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا ۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک اس علٰحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابل اعتراض ہے ۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسمار ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام " ہندی" تمام باشندگان ہند کیلیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس ہی باقی نہ رہے ۔ فرماتے ہیں :-

" " ہندی" کو زبان کیلیے نہیں بلکہ " اہل ہند" کیلیے اختیار کرنا چاہیے ۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں ۔ صرف

اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّ اعظم کی علحدہ علحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کریں۔"

"ہم علحدہ علحدہ مذہبی اقوام ہیں۔" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے جسے مٹا دینے کی ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک، ہندوستان دوزخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں!! یہ ثابت ہو جانا کہ ہم اس برّ اعظم کی علحدہ علحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہو جانا ہے کہ ہم دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کیلیے اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو "علحدہ مذہبی اقوام" ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں ـــــ یہ ہیں اُس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابو الکلام آزاد نے صوبۂ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کیلیے منتخب فرمایا ہے[1]۔

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبۂ اسلامیات قائم کیا ہے جسکے کارکن مسلمان ہیں، اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کیلیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات

[1] اس موقع پر مولانا ابو الکلام کے "تذکرہ" میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جنہوں نے دورِ اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کے ساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ان شاء اللہ ازدیادِ بصیرت کے موجب ہوں گے۔

کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے، چنانچہ جمعیت علمار ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"دورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا اور محض مسلمانوں کی دل دہی اور سہولت کار کیلیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا" (الجمعیۃ مورخہ ۵ رمضان ۵۶ھ)۔

بیچارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس! اس نے آج تک کوئی شعبۂ ہندویات وسکھیات و پارسیات نہیں کھولا، مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور ہے کہ خاص ہمارے لیے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔ اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمعیۃ ہی میں ۱۸ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :-

"ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضہ اس درجہ شدید اور انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں اس لیے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گذشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کیلیے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال

چھیڑا تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیئے۔ سارڈا ایکٹ کے خلاف جو ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے .... ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں۔"

غور فرمایئے مسلمان بچوں کیلئے تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے، سامراج کی حمایت ہے، ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدو جہد کے بعد معزول کر دیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ دراصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے ــــ "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر"، ان دو اصطلاحوں کا مفہوم جواہر لال اور انکے "شعبۂ اسلامیات" کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کرونگا ــــ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں ــــ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :-

"یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمراں طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں۔ لوگ اسلامی

تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہرصورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمران تھے[1]...

البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا کہ آج کل ہو گیا ہے۔ آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کیلیے دو چار ہندو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں (چاہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ۔"

دیکھیے! "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور انکی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے! انکے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی

---

[1] جہالت ملاحظہ ہو۔ جو حدیث انسان کی انفرادی ذمہ داری و مسئولیت کا عظیم الشان اخلاقی تصور پیش کر رہی ہے اس کی معنویت کو کس بری طرح خاک میں ملایا گیا ہے۔ پھر اس علم اور اس فہم پر جسارت کا یہ حال ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ماہرانہ گفتگو فرمائی جاتی ہے۔

آواز کو ایک ریکارڈ میں بھروا دیا ہے، اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت، پنڈت جواہر لال کیطرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں ۔۔ یا اگر ناآشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگتراشی اور مصوری کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بارہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کیلیے تیار ہو جاؤ جن کا تقاضا، فضا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور انکی امت کے رجحانات کر رہے ہیں۔۔

حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کیلیے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طریق فکر، اُس نظریۂ حیات، اور اُس معیار امتیاز

انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتد بہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلّی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرزِ خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرتِ رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر ہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اسکی زبان، اسکے لٹریچر، اس کے آداب و اطوار، اسکے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس و طرز معاشرت، اور اسکے فنون لطیفہ میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سند جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہینگے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلّت سے متجاوز

ہو گی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہر حال جب تک ان کے اندر اسلامی ذہنیت کی روح موجود ہو گی، اور جب تک یہ شریعت اسلامی کے ضابطہ میں رہیں گے، ان پر یکساں "اسلامی تمدن" کا اطلاق ہو گا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کریں گے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کریں گے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعت اسلام کے خلاف ہوں تو بلا شبہ یہ کہا جائیگا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ

> "اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اس گذرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اس بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں۔"

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شاید یورپ کے سیاسی بازیگروں سے بھی بن نہ آتی۔ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم اس معاملہ میں ان سے بھی بازی لے گئے۔

ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کیلیے

نہیں اٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمراں طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا، بلکہ اس لیے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کیلیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کیلیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اُس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے۔ اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اسلیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راستبازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشستی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کیلیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اسکے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کیلیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کیلیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب

باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کایستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلے میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے! ــــ مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سنیے:۔

"جاگیرداری اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی، ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہو کر ایران پہنچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کیلیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتر فرقے ضرب المثل ہیں۔"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوع کی تمام مثالیں کس مقصد کیلیے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا

مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہنکر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھاکر، بہتّر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے بکسر محروم ہوکر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social seroice) کیلیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کردو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز کی تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضائقہ ہوجائیگا؟ — اسی مقصد کو چھپاکر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں - ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے - ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں"

اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اُس سماجی انقلاب (Social Reuolution) کیلیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہرلال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں - اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جارہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علمار ہند کا واحد ترجمان ہے - کیسے صحیح راستہ پر جارہی ہے "یہ آزادی کی فوج"! شردھانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا - جواہرلال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جارہی ہے -

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپنے ملاحظہ فرمالیے - ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگائی - اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو-

اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن جناب منظر رضوی صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور نے نومبر ۳۸ء کی کئی اشاعتوں میں درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:-

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اسکے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے ..... لیکن یہ یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) بنیگی۔ بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہونگی خون کی ندیاں بہینگی اور سب کچھ ہوگا۔ اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار، پونجی او مکانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا، یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، اور سیٹھ والمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس"۔

"ہماری آنیوالی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کیلیے ہر ہتیار کو استعمال کریں گے"....

.... پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے۔ دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے، امیروں کو نیچے آنا ہے۔ غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا

لہ ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب کانگریس سکرٹریٹ سے الگ کر دیئے گئے (۸۱) لیکن انکی علحدگی کا سبب یہ مضامین اور یہ پالیسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ لہذا ان مضامین کی ذمہ داری سے کانگریس سکرٹریٹ اب بھی بری الذمہ نہیں ہے۔

سلیئے اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں۔"

"ہندوستان میں امیر اور غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیری کے یہ وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کو دور کرنیکا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ . . . . . . یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب، سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو شائد زیادہ سے زیادہ

ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں...... جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا......اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جنکے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور کان ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔

اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کیلئے کہا جاتا ہے"

"خیر تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں ان میں کوئی یگانگت نہیں......مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں"

یہی منظر صاحب اپنے ایک دوسرے مضمون میں (مدینہ مورخہ ۱۳ دسمبر ۳۸ء) فرماتے ہیں:۔

"غریبوں، مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لئے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ .... اس پیٹ کیلئے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑیگی"

چند اور فقرے اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں:۔

"اس وقت ہندوستان میں دو ہی سوال اس اعتبار سے ہیں۔ سرمایہ داری استحصال اور غلامی یا ترقی، اشتراکیت اور آزادی۔ بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہمارا کوئی درمیانی مسلک نہیں ہو سکتا"

"اسی رد عمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے جو زمین پر ایک جنت ہے۔ وہاں بے روزگاری،

بھوک، جہالت اور تنگ دستی کا نام نہیں۔"

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی فکر ہمارے فقیہوں اور محدثوں کو ہو سکتی ہے، نہ کہ عیاش رئیسوں کو، سو ہمارے فقیہہ اور محدث اور علماء آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے، جب سے قومی تحریک کی شروعات ہوئی ہے، ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارا نصب العین مذہبی نہیں ہے، بلکہ محض اقتصادی اور سیاسی ہے ہمیں تو آج کے حالات میں رہ کر، آج کے حالات سے اپنی قیادت قائم کرنی ہے۔ علماء کا ایک طبقہ ایک ہی چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرا حلال۔ آج انہی کا ایک طبقہ تحریک کو شجرِ ممنوعہ سمجھتا ہے اور دوسرا خیر و برکت کا مجموعہ۔ اور پھر اس کا کیا یقین ہے کہ جب ہم ایک نئی سماج اور نئے نظام معاش کی تاسیس کرنے لگینگے، جب ہم شخصی ملکیت کو خارج اور ختم کر کے ملک کی دولت اور اسکی پیداوار کو نئے طریقوں پر تقسیم کرنے لگینگے تو اس وقت بھی یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا۔" [1]

۱۳ دسمبر ۳۷ء ہی کے "مدینہ" میں پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکرٹری منشی احمد دین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"ہم تو دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائیگی وہ محنت اور سرمایہ، غریب اور امیر، بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی، جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہونگے۔ گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہونگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا فرقہ وارانہ جنگ

[1] خط کشیدہ فقرے علمائے کرام کیلیے خاص طور پر غور کے لائق ہیں۔

طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہو گئی۔"

ان طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی کس وفاداری کے ساتھ اُس مشن کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں جو انکے غیر مسلم لیڈروں نے ان کے سپرد کیا ہے۔

حصول آزادی کا طریقہ

پچھلے دونوں ابواب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ناظرین کو ان تنقیحات کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو میں نے اس سلسلہ کے تمہیدی مباحث میں قائم کی تھیں۔ ان تنقیحات میں سے اولین تنقیح یہ تھی کہ:

"ہمیں کسی جنگ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کیلیے طریقہ کونسا اختیار کیا جارہا ہے۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جارہا ہے جو ہماری تہذیب اور ہمارے نظام اجتماعی کے اصولوں سے متصادم ہوتا ہو، تو ہم اس کے ساتھ تعاون نہیں کرسکتے۔"

اس تنقیح کو پیش نظر رکھ کر دیکھیے کہ کانگریس کے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں اور کارکنوں کی جو تحریریں پچھلے دو ابواب میں نقل کی گئی ہیں ان سے حصول آزادی کے کس راستے کا نشان ملتا ہے۔

ان کے نزدیک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

اس غرض کے لیے وہ سب سے پہلے اسلامی قومیت پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ جب تک مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ پیروان اسلام ایک قوم ہیں اور منکرین اسلام دوسری قوم، اس وقت تک آٹھ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کا ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہو جانا محال ہے۔ اسی لیے تمام قوم پرست یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ "مسلمان" کسی قوم کا نام نہیں ہے، اور اسی لیے انکی

تعلیم یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو "مسلم" کہنے کے بجائے "ہندی" کہیں۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن نہ اختیار کرلیں۔ عقائد، جذبات واحساسات، لباس، طرز زندگی، زبان، ادب، اور قوانین معاشرت و تمدن کے لحاظ سے جب تک مسلمانوں میں یکجہتی باقی ہے اس وقت تک بہر حال وہ اپنے آپ کو ایک قوم ہی سمجھتے رہینگے، اور جب تک ان امور میں وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے مختلف ہیں، اس وقت تک بہر حال ان کا قومی تشخص دوسروں سے الگ ہی رہیگا۔ اس علحدگی کو مٹانے کیلیے مسلمانوں میں پورے زور شور کے ساتھ یہ تبلیغ کی جارہی ہے کہ ان کی نہ کوئی خاص تہذیب ہے اور نہ کوئی مخصوص تمدن "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے جو تہذیب پیدا ہو رہی ہے، اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں میں جو تمدن نشو ونما پا رہا ہے، اسے انکو بے تکلف قبول کرنا چاہیے تاکہ وہ سب کے ساتھ ہم رنگ ہو جائیں۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے۔ مسلمانوں میں اشتراکیت کی تبلیغ جو کی جارہی ہے اس کا مقصد دراصل یہی ہے کہ صرف اسی ذریعہ سے اسلامی سوسائیٹی کے نظام کو پارہ پارہ کیا جاسکتا ہے، اور مسلمانوں کی جماعت کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرکے فرداً فرداً غیر مسلم آبادی میں جذب کرنے کے لیے اسکے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔ کانگریس کے متعلق یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے، نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے، نہ اُس سماجی (تمدنی) انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر جواہر لال اور سوباش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں۔ ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوباش چندر بوس کی صدارت

میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بری طرح ڈانٹا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے کہ :

"تم کانگریس میں دست راست اور دست چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے ..... ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت کر رہے ہیں، مگر وہ وقت آرہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کرسکینگے"

(ٹائمز آف انڈیا - مورخہ ۲۲ر فروری ۳۸ء)

اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اقنوموں میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا - کانپور، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں - مدراس اور صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا، وہاں کانگریسی حکومتوں ہی نے ان کی سرکوبی کی ہے - ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کمیونک شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ :

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کیے جا رہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں - ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی حد سے گزرتی جا رہی ہے اور اس ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے، اسلیے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پبلک کو ان سے متنبہ کر دے تاکہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں ایسی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک کی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے"

اس کے بعد اس کمیونک میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں :-

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج، یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس ملک میں طبقہ

دارانہ جنگ برپا کریگی اور قومی انقلابی ہڑتال کا اعلان کریگی - کاریگر اپنے اوزار رکھ دینگے - دماغی کام کرنے والے دفتروں سے نکل آئینگے - طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آجائینگے - کسان مالگذاری اور لگان دینے سے انکار کردینگے - ریلیں کھڑی ہوجائینگی - کارخانے اور مل اور بجلی گھر بند ہوجائینگے ......" (ملاحظہ ہو اخبار ہریجن - مورخہ ۲۰ اگست ۳۸ء)

یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکرٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی صاحب شائع کرچکے ہیں - مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے، اور جب حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کیلیے ان کی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف تنبیہی کیمونک نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس کی سرکاری پالیسی نہیں ہے، بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف اس غرض سے پھیلایا جارہا ہے کہ اسلامی سوسائیٹی کو درہم برہم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں - حال میں بنگال کے کانگریسی مسلمانوں کا ایک اجتماع بابو سوباش چندر بوس کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا - زیر بحث یہ سوال تھا کہ عامۂ مسلمین میں کانگریس کے خیالات اور اصول کامیابی کے ساتھ کس طرح پھیلائے جاسکتے ہیں، اور جو مشکلات اس راہ میں حائل ہیں، ان کا حل کیا ہے طویل بحث وتمحیص کے بعد جو بات بالاتفاق طے ہوئی وہ یہ تھی کہ :

"مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کیلیے ایک معاشی پروگرام کو پیش کرنا، ناگزیر ہے اور پروگرام ایسا ہونا چاہیے جو محنت پیشہ عوام کو اپیل کرسکے" (نیشنل کال - مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء)

"معاشی پروگرام" کے لفظ کو خاص طور پر نوٹ کیجیے - اس چھوٹے سے مرکب لفظ میں وہ تمام معانی بھرے ہوئے ہیں جنکی تشریح آپ پنڈت جواہر لال نہرو اور منظر رضوی اور کامریڈ احمد دین صاحبان کی زبانوں سے

سُن چکے ہیں۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ عام مسلمان خواہ کتنے ہی جاہل ہوں، مگر پھر بھی انہیں اسلام سے گہری محبت و عقیدت ہے، اور کوئی شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ اسلیے ان میں علانیہ الحاد و بے دینی کی تبلیغ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ اگر اُن کے سامنے "روٹی" پیش کی جائے، اور اس میں بے دینی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو یہ بھوک کے مارے ہوئے غریب لوگ لپک کر اسے لے لینگے اور بے تکلف حلق کے نیچے اتار جائینگے۔ ادہر سے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر وہ ہر زہر کو خوشی سے ہضم کر سکتے ہیں۔

یہی کچھ سمجھ کر یہ لوگ خستہ حال مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کیلیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں "جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے"۔ پھر جب بیچارا بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر انکی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں، اور اس سے کہتے ہیں کہ "غریب اور مفلس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسکا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتہ ہے۔ اسکا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے"۔ مذہب اشتراکیت کا یہ ابتدائی سبق جس آن اس بیچارے جاہل مسلمان کو دیا جاتا ہے، اسی آن اسے یہ پٹی بھی پڑھائی جاتی ہے کہ "مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پایندہ ہی رہا ہے"۔ اور پھر مزید ضمانت کے طور پر اس سے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی "مذہب کی سب سے بڑی فکر تو فقیہوں اور محدثوں ہی کو ہو سکتی ہے، سو دیکھ لو کہ یہ فقیہہ اور محدث اور علماء ہمارے ساتھ ہیں"۔

روٹی کو دین اور روٹی ہی کو ایمان قرار دینے کے بعد یہ آگے بڑھتے ہیں اور ان پڑھ مفلس

مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو میاں! تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری ہی طرح بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ تمہیں جو کچھ ملیگا انہی کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے سے ملیگا۔ اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جن کے پاس تم سے زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے، انہی سے لڑکر مل سکتا ہے۔ پس آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔

اس تبلیغ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسکا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں جوں یہ خیالات عام مسلمانوں کے دلوں میں گھر کرینگے، اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوتی چلی جائیگی۔ اسلام میں سوسائٹی کا نظام دین کی وحدت پر قائم ہے۔ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالتِ محمدی کے قائل ہیں، ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاریؓ کی طرح قلاش۔ (رضی اللہ عنہما)۔ اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور انہی تعلقات سے یہ سب مل کر ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی تبلیغ ان کو معاشی حیثیت سے الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرتی ہے، اور ان کو یہ سکھاتی ہے کہ ایک معاشی طبقہ کا مسلمان دوسرے معاشی طبقہ کے مسلمان سے لڑے اور اس کو اپنا دشمن سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد یہ ایک سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ طبقہ وارانہ جنگ ان کے درمیان صرف معاشرتی تعلقات ہی کو منقطع نہ کردیگی بلکہ خالص دینی حرکت و عمل میں بھی ان کا آپس میں ملنا غیر ممکن ہو جائیگا۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جنکے درمیان روٹی کی جنگ چھڑ گئی ہو وہ ایک دوسرے کیساتھ مسجدوں میں جمع ہوں، یا وہ مالدار مسلمان اپنے اس غریب مسلمان بھائی کو زکوٰۃ دے جسکے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اسکا گھر لوٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اسیطرح یہ بھی ناممکن ہے کہ جو لوگ معاشی اغراض کیلئے ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہوں اور جنکے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و حسد کی آگ بھڑک چکی ہو وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں، اور انکے

درمیان انما المومنون اخوۃ کا رشتہ قائم رہ جائے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عوام مذہب سے قطعی بیگانہ ہوتے چلے جائینگے۔ معاشی طبقات کی جنگ عامۂ مسلمین کو صرف بڑے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں اور لکھ پتیوں ہی سے الگ نہ کریگی، بلکہ متوسط طبقہ کے ان تمام مسلمانوں سے کاٹ دیگی جو نسبتہً خوشحال ہیں۔ منظر رضوی صاحب کے اپنے اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کے مسلمان تقریباً ایک کروڑ ہیں اور عام مفلس مسلمان سات کروڑ۔ طبقہ واری جنگ کے معنی ان ایک کروڑ مسلمانوں سے سات کروڑ مسلمانوں کے برسرپیکار ہوجانے کے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اپنے دین کا علم، اپنی تہذیب کا شعور، احکام شرعیہ کی واقفیت، جو کچھ بھی ہے، اسی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہی طبقہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔ عوام انہی سے دین سیکھتے ہیں، انہی سے احکام معلوم کرتے ہیں، اور انہی کے اثر سے تھوڑے یا بہت اسلامی نظام تہذیب و تمدن کی گرفت میں رہتے ہیں۔ جب طبقہ واری جنگ کی بدولت سات کروڑ عام مسلمان ان ایک کروڑ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہوجائینگے تو وہ اسلام سے بالکل بیگانہ ہوکر رہ جائینگے۔ خود ان کے پاس کوئی علم نہ ہوگا۔ اور جب متوسط طبقہ کے لوگ ان کو دین کے احکام سنائینگے تو اشتراکیت کا مبلغ فوراً پکار کر ان سے کہیگا کہ ہوشیار! پھر ہی مذہب کی افیون تمہیں کھلائی جارہی ہے، اور پھر اسی "منظم مذہب" کے پھندے میں تم کو پھانسا جارہا ہے جو "اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانیکا قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کا حمایتی ہے"۔

اس کا آخری اور فیصلہ کن نتیجہ یہ ہوگا کہ عامۂ مسلمین جب اسلامی قومیت کے تخیل سے خالی الذہن ہوکر فرد فرد بن جائینگے، اور جب وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایک لفظِ بے معنی سمجھ کر

اس غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کرتے چلے جائینگے جو زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہا ہے، اور جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر وہ اپنے معاشی طبقہ کے غیر مسلموں میں جا ملینگے، تو خود بخود انکی شدھی ہو جائیگی اور وہ آہستہ آہستہ غیر اسلامی قومیت میں اس طرح جذب ہو جائینگے جیسے نمک کی ڈلی پانی میں گھل گھل کر آخر کار غائب ہو جاتی ہے۔ رہے متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام کے خلاف کسی سماجی اور معاشی نظام کو قبول کرنے سے انکار کرینگے تو ان کے حق میں پنڈت جواہر لال نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ "جو سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں انہیں مٹا دینا چاہیے" اور یہ کہ "اگر اکثریت نظام تمدن کو بدلنے کی خواہشمند ہو تو ضروری نہیں کہ اقلیت کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس پر مؤثر دباؤ ڈالنا چاہیے اور جبر و تشدد سے کام لینا چاہیے"، اور یہ کہ "جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھے"۔

یہ ہے وہ راستہ جو آزادی حاصل کرنے کیلیے قوم پرستوں نے تجویز کیا ہے اور جس پر وہ عملاً چل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہ بنا دیا جائے، اور ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ مسلمان قوم کا وجود کلیتہً ہندوستانی قومیت میں تحلیل نہ ہو جائے۔ لامحالہ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حصول آزادی کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مسلمان قوم پہلے ختم ہو گی اور آزادی اسکے بعد حاصل ہو گی۔ اب میں علمائے دین اور مفتیان امت سے اور ہر اُس مسلمان سے جو اسلام اور قوم پرستی کا بیک وقت دم بھرتا ہے، دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسلام اور یہ قوم پرستی صریحاً ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی حاصل کرنا قرآن، حدیث،

عقل غرض کسی چیز کی رو سے بھی مسلمانوں کا فرض ہے بلکہ فرض کیا معنی، میں پوچھتا ہوں کہ آزادی کیلیے قومی خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز بھی ہے؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کیساتھ موالات کرنا صریح تعلیمِ قرآنی کے خلاف نہیں ہے؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور جماعت اسلامی سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دام ہمرنگ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا، اور اِسکی فوج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک گرم عمل نظر آرہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیشرو تحریک سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک ہے۔

پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس طریقہ سے جو آزادی حاصل ہو گی وہ ان آٹھ کروڑ یا سات کروڑ جسموں کیلیے تو آزادی ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مگر اُس قوم کیلیے آزادی نہیں ہو سکتی جو "مسلمان" ہے۔ مسلمانوں کیلیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آزادی نہ ہو گی بلکہ انکی قومیت، انکی تہذیب اور ان کے نظام اجتماعی کی کامل بربادی اور اس کام کی تکمیل ہو گی جسکو انگریزی امپیریلزم نے ڈیڑھ سو برس پہلے شروع کیا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا حربہ ہے جو انگریزی سلطنت سے پہلے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اُس سے پہلے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی صاحب عقل مسلمان جو مسلمان رہنا چاہتا ہو اس حربے کو خود اپنے دین اور اپنی قوم پر چلانے میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی جواہر لال اور وہی ان کے قوم پرست ساتھی جنہوں نے حصول

آزادی کے اس طریقہ کو کھلم کھلا اختیار کیا ہے، ہم مسلمانوں کو آزادی کی مخالفت اور سامراج پرستی کا طعنہ بھی دے رہے ہیں کیونکہ ہم اپنی قبر کھودنے میں ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت آزادی کے دشمن اور سامراج پرستی کے مجرم وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود ہی آزادی حاصل کرنے اور سامراج سے لڑنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسکو ہندوستان کی ۱/۴ آبادی کسی طرح قبول کر ہی نہیں سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود ملک کی آزادی کو دور پھینک رہے ہیں، اور سامراج کی مدد کر رہے ہیں، اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم آزادی کی جنگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کو مدد دے رہے ہو! اگر ان کے پاس عقل ہے تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ کوئی جماعت اپنے جماعتی وجود کو فنا کرنے کیلیے آزادی نہیں چاہا کرتی اور نہیں چاہ سکتی۔ آزادی کی ضرورت قومی زندگی کیلیے ہوتی ہے نہ کہ قومی موت کیلیے، لہذا آزادی کی خاطر ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے مگر قومی زندگی قربان نہیں کی جاسکتی۔ تم جب کسی قوم کے سامنے آزادی کا وہ راستہ پیش کرتے ہو جس میں اسکی قومیت کی موت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اسکو مجبور کر رہے ہو کہ وہ تمہاری تحریک آزادی سے لڑے۔ اس کا یہ لڑنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو، ایسی حالت میں بہرحال لڑیگی، اور اگر اس لڑنے کا یہ نتیجہ ہو کہ بیرونی اقتدار کو اس سے فائدہ پہنچے تو اسکی کچھ پروا نہ کریگی، اسلیے کہ بیرونی اقتدار کا نقصان بھی زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو اس نام نہاد تحریک آزادی کا ہے، یعنی اسکی قومیت کی موت۔ پھر ایک موت اور دوسری موت میں آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

جنگ آزادی کا مطمح نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ جس آزادی کیلیے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اسکی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لیے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرینگے۔ ایک یہ کہ اس جنگ آزادی کا مطمح نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظام حکومت کو گرانا اور دوسرا نظام حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے؟ پہلے حصہ کو ہم مقدم رکھینگے اور دوسرے حصہ سے اخیر میں بحث کرینگے۔

جو لوگ اس وقت آزادی وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان کے مطمح نظر کو سمجھنے کیلیے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذبات حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہ راست انگریزی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے، اور ان میں آہستہ آہستہ

وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کیلیے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جسکے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز، مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیشِ نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اسی غرض کیلیے اسکی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اس انجمن کا اجتماع ہو وہاں کا گورنر اسکی صدارت کرے۔ مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا، اسکے خیالات کو بدل کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:۔

"ہندوستان میں ایسی ایک جماعت ہونی چاہیے جسکی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اسکی آزادی رائے میں خلل انداز ہوگی"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ (Caird)، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ (Slagg.) اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو پسند کیا، اور اسطرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس ہوئی[۱]۔

سیاسی عمل کی یہ ابتدا جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبّر کی رہنمائی میں ہوئی اسی طرح مقاصد اور انکے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت، اور انگریزی دستورِ حکومت کے نمونے پر ہوتا رہا۔ کانگریس کو اول یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام

[۱] ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۳-۲۴

سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود تھی اور یہ اسکی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جارہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اسکے لیے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کیلیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:

"قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشو و ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہد حکومت میں پیدا ہوئے ہیں[1]"

دوسرے اجلاس کے خطبہ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیئے جن میں پوری قوم براہ راست حصہ دار ہو۔ اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کے سپرد چھوڑ دینا چاہیئے[2]"

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔ جس طرح ۱۸۸۵ء میں بینرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اسکو زبردستی مسلط کر رہے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجہ میں پوچھتے ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہے یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں؟" اور خود ہی اسکا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اسکو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک قوم کیلیے ایک زبان بنانے میں کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرے[3]۔ نہرو جی استفہام کی بھی ضرورت

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۷۲۔

[2] *How India Wrought for Freedom*, by Annie Besant. p. 18

[3] "Congressman Beware," by Gandhi, in *The Harijan*, 10—9—38

نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جدا جدا مستقل قوموں کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریز مربیوں کی سیاسی تربیت سے اخذ کیا گیا وہ جمہوریت (Democracy) کا تصور تھا۔ جمہوری ادارات کی مختلف صورتیں جو دنیا میں رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں شاید سب سے زیادہ ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے جمہوریت کا نام اس نے سُنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے، اس لیے یہ جب "جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمائندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت اور دستور سلطنت کی ساری کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کی توں انگلستان سے ہندوستان اٹھالانا چاہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے ادارات ایک ملک کے مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر راست آسکیں۔ قوت تمیز اور اجتہاد فکر کے بغیر محض دوسروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل بلکہ مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اسکے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت اور محدود واقفیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ وہ جمہوری ادارات کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، لہذا اس طرز کی مخالفت کرنا نفس جمہوری ادارات کی مخالفت کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لائے ہیں، اور جسکی پشت پر مشین گن کی طاقت ہے، ہندوستان میں رائج

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ دوم

ترجمان القرآن کی یہ اشاعت خاص جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے ہلکے کاغذ پر چھپوا کر ذیل کے نرخوں پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ جو مخیر حضرات، یا اسلامی اور سیاسی انجمنیں اپنے اپنے حلقوں میں اس کتاب کو پھیلانا چاہیں۔ وہ ذیل کے نرخوں پر ہم سے طلب کر سکتے ہیں:-

کرایہ ریل و خرچ ڈاک بذمہ خریدار

قیمت ۱ کاپی	۸ آنے
قیمت ۵ کاپی	۲ روپے ۴ آنے
قیمت ۲۵ کاپی	۱۱ روپے ۸ آنے
قیمت ۵۰ کاپی	۲۲ روپے
قیمت ۱۰۰ کاپی	۴۰ روپے

مہتمم شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ۔ پنجاب)

موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اول

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	۵ نسخے		علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	}	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے		

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے بذمہ خریدار۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

[illegible] میں طبع ہوا